خالدہ حسین کے افسانوں میں نسائی مسائل: روایتی اور جدید سماجی تناظر میں: تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

مبین عنایت

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۱ء

خالدہ حسین کے افسانوں میں نسائی مسائل: روایتی اور جدید سماجی تناظر میں: تجزیاتی مطالعہ

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

مقالہ نگار:

مبین عنایت

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۱ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **خالدہ حسین کے افسانوں میں نسائی مسائل: روایتی اور جدید سماجی تناظر میں: تجزیاتی مطالعہ**

پیش کار: **مبین عنایت** رجسٹریشن نمبر: 1518/M/U/F18

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر شفیق انجم
نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر صوفیہ لودھی
ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

ڈاکٹر محمد سفیر اعوان
پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ

اقرار نامہ

میں، مبین عنایت حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام، میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر شفیق انجم کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

مبین عنایت

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ کے دفاع کی منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرست ابواب	v
Abstract	vii
اظہارِ تشکر	ix
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	۱
الف) تمہید	۱
i. موضوع کا تعارف	۱
ii. بیان مسئلہ	۲
iii. تحقیقی مقاصد	۲
iv. تحقیقی سوالات	۳
v. نظری دائرہ کار	۳
vi. تحقیقی طریقہ کار	۳
vii. مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق	۴
viii. تحدید	۴

ix. پس منظری مطالعہ ۴
x. تحقیق کی اہمیت ۵

ب) نسائی مسائل: روایتی اور جدید سماجی تناظر میں ۵
ج) نسائیت اور تانیثیت میں فرق ۱۴
د) برصغیر کے روایتی سماجی تناظر میں معاش، جنس اور شناخت کے مسائل ۲۷
ہ) خالدہ حسین: سوانحی و ادبی آثار ۳۸

حوالہ جات ۴۶

باب دوم: خالدہ حسین کے افسانوں میں روایتی سماجی تناظر اور نسائی مسائل: تجزیاتی مطالعہ ۵۰

الف) روایتی اعتقادی نظام اور توہم پرستی ۵۲
ب) تمدنی عادات اور رسوم و رواج ۵۹
ج) روایتی سماج میں عورت اور مرد کا رشتہ اور عائلی مسائل ۶۶
د) روایتی سماجی تناظر میں معاش، جنس اور شناخت کے مسائل ۷۷

حوالہ جات ۸۸

باب سوم: خالدہ حسین کے افسانوں میں جدید سماجی تناظر اور نسائی مسائل: تجزیاتی مطالعہ ۹۱

الف) جدید زندگی کے تصورات اور نسائی تشخص کے مسائل ۹۵
ب) جدید زندگی کا تمدنی و اخلاقی نظام ۱۰۰

ج) جدید زندگی میں عائلی مسائل و معاملات ۱۰۴

د) جدید زندگی میں معاش، جنس اور آزادی کے مسائل ۱۱۲

حوالہ جات ۱۲۴

باب چہارم: ماحصل ۱۲۷

مجموعی جائزہ ۱۲۷

تحقیقی نتائج ۱۳۱

سفارشات ۱۳۲

کتابیات ۱۳۴

Abstract

This research thesis is titled "*Women Issues in Khalida Hussain's Short Stories:* An Analytical Study of Modern and Traditional Social Context". Feminism covered those thoughts and feelings of women which are born under the experiences, observations, domestic violence and oppression. This study was limited to these *Khalida Hussain's* short stories collections i.e *Darwaza, Pehchaan, Masroof Aourat, Hain Khawab main Hanooz, and Main Yahan Huu.* There are many issues for women in modern and traditional society. Due to these issues, many social vices are born. Although these vices are considered minutes but caused moral and social disorder. *Khalida Hussain* has described this situation with literary context in her short stories in Pakistani Society. There is a subjective diversity in Khalida Hussain short stories but this study was limited to women issues in her short stories collection. *Khalida Hussain* short stories were collected as primary source. Some interviews were also conducted to view her life and personality. Research journals, thesis, short stories collection, and books on feminism were included in the study. For the access to these materials, public libraries and personal libraries were used. *Khalida Hussain* is an important short story writer of Urdu literature. She has an acute observation ability like other contemporary writers. She has portrayed women issues in her writings. It is necessary to analyse her short stories by keeping in view the diversity of topics. This study is an effort in this regard.

اظہارِ تشکر

اس مقالے کی تکمیل میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کی صدر شعبہ اردو پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ڈاکٹر عابد حسین سیال، ڈاکٹر روبینہ شہناز، کوآرڈینٹر ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر محمود الحسن، ڈاکٹر رخشندہ مراد، ڈاکٹر نازیہ یونس، ڈاکٹر ارشاد بیگم، انتہائی واجب الاحترام اساتذہ کرام اور خصوصاً اپنے نگران مقالہ جناب ڈاکٹر شفیق انجم صاحب کی بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے شفقتوں سے نوازا اور ہر لمحہ میری حوصلہ افزائی کی۔ مقالے کے آغاز سے آخر تک قدم قدم پر آپ نے میری رہنمائی کی اور حوصلہ بڑھایا۔ اس طرح مقالے کی مشکلات آہستہ آہستہ میرے لیے آسان ہوتی گئیں۔ اس عظیم شفقت پر میں ہمیشہ آپ کے لیے دعا گو رہوں گی۔ اس مقالے کی تیاری میں شعبہ اردو کے جن دیگر دوست احباب اور عزیزوں کا تعاون حاصل رہا ان سب کی احسان مند اور شکر گزار ہوں۔ اپنے والدین اور عزیز رشتہ داروں کی بے حد شکر گزار ہوں کہ جن کی محبت اور مسلسل دعاؤں سے یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔

آخر میں اپنے رب کی سب سے زیادہ شکر گزار ہوں اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ کیونکہ اس نے میری دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا اور مجھے کامیاب کیا۔

مبین عنایت

سکالر ایم فل اُردو

باب اوّل

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

i. موضوع کا تعارف

میرے ایم فل اردو کے مقالے کا موضوع "خالدہ حسین کے افسانوں میں نسائی مسائل: روایتی اور جدید سماجی تناظر میں تجزیاتی مطالعہ "ہے۔ خالدہ حسین موجودہ دور کی اہم افسانہ نگار، ناول نگار، مترجم اور ڈرامہ نگار تھیں۔ خالدہ حسین کے پاس اپنے عصری مسائل کے مشاہدے کی بے پناہ قوت موجود تھی۔ موضوعاتی حوالے سے ان کے ہاں تنوع ملتا ہے۔ خالدہ حسین کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے افسانوں میں اگر موضوعاتی تنوع کو دیکھا جائے تو بہت سے موضوعات ملتے ہیں جن میں جدید سماج میں فرد کے مسائل، فرسودہ رسم و رواج، نفسیاتی مسائل، سماجی مسائل، حقوق نسواں، تصوف، اولاد کی اہمیت، اولاد کی پرورش کے مسائل بیوہ کے مسائل، جنسی بے راہ روی اور دیگر مسائل جن کے سماج پر اثرات ہوتے ہیں جیسے موضوعات قابل ذکر ہیں۔

عورت ازل سے ہی معاشرے کا ایک اہم فرد رہی ہے۔ عورت کی معاشرے میں شناخت بطور ماں، بہن، بیٹی کی تو ہے لیکن بطور عورت اس کی کوئی پہچان اور شناخت نہیں ہے عورت بطور عورت اب اپنا وجود منوانے کی تگ و دو میں ہے۔ وہ خود مختار ہونا چاہتی ہے۔ وہ اپنی شناخت خود بننا چاہتی ہے وہ مرد کی طفیلی نہیں بننا چاہتی۔ وہ مرد کے مساوی حقوق کا تقاضا کر رہی ہے۔ ہر معاشرے نے جہاں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق رہنما اصول وضع کیے ہیں وہیں اس کے نسائی پہلو بھی اجاگر کیے ہیں۔ معاشرے نے زندگی کے ہر مسئلے

پر رہنمائی فراہم کر دی ہے لیکن جب ان سے انحراف کیا جاتا ہے تو معاشرے میں ایک بگاڑ کی سی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔

خالدہ حسین نے اپنے افسانوں میں جہاں دیگر موضوعات کو پیش کیا ہے وہیں ان کے افسانوں کا ایک اہم پہلو نسائی مسائل: روایتی اور جدید سماجی تناظر میں پیدا ہونے والے مسائل بھی ہیں۔ خالدہ حسین نے اپنی تحریروں میں اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو سماجی اصولوں کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کی ہے اور ان بنیادی مسائل کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے جو بظاہر معمولی نظر آتے ہیں لیکن ان کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانوں میں سچی کہانیوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ عورت کے بنیادی حقوق اور تقاضے کی علمبردار بن گئی ہیں۔

ii. بیان مسئلہ

خالدہ حسین بحیثیت افسانہ نگار اپنے عہد اور سماج کے مسائل کو اپنا موضوع بناتی ہیں اور موجودہ دور کے اہم سماجی، نفسیاتی، اخلاقی اور معاشرتی مسائل کو اس انداز میں پیش کرتی ہیں کہ ان کی اصلاح کی جا سکے جہاں وہ ان مسائل کو قاری کے سامنے لانے کی کوشش کرتی ہیں وہاں ان کا حل بھی بتاتی ہیں۔ انھوں نے بطور خاص اپنے سماج میں عورت کے نسائی مسائل پر لکھا ہے۔ زیر نظر مقالے میں خصوصیت کے ساتھ نسائیت کے حوالے سے ان کے افسانوں کو زیر بحث لایا ہے تا کہ ان افسانوں کی اہمیت و انفرادیت واضح ہو سکے۔

iii. مقاصد تحقیق

زیرِ نظر تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں۔

i. روایتی اور جدید سماجی تناظر میں نسائی مسائل اور ان کے محرکات کو زیر بحث لانا۔

ii. خالدہ حسین کے افسانوں میں روایتی اور جدید سماجی تناظر میں نسائی مسائل کی نوعیت کا جائزہ لینا۔

iii. خالدہ حسین کے افسانوں میں نسائی مسائل کے محرکات اور پس منظر کا جائزہ لینا۔

iv. تحقیقی سوالات

i. روایتی اور جدید سماجی تناظر میں نسائی مسائل کی نوعیت کیا ہے؟

ii. خالدہ حسین کے افسانوں میں نسائی مسائل کی نوعیت کیا ہے؟

iii. خالدہ حسین کے افسانوں میں نسائی مسائل کے سماجی محرکات کون کون سے ہیں اور انھیں روایتی اور جدید سماجی پس منظر میں کیسے زیر بحث لایا جاسکتا ہے؟

v. نظری دائرہ کار

ہر سماج میں عورت کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک ضابطہ اخلاق ہے اور عورت کے حقوق کے تحفظ کے حوالے سے کچھ اصول وضع کر دیے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی خلاف ورزی سے سماجی سطح پر جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ بظاہر عام یا معمولی تصور کی جاتی ہیں مگر یہ خرابیاں سماجی بگاڑ اور اخلاقی تنزلی کا باعث بنتی ہیں۔ پاکستانی سماجی تناظر میں دیکھا جائے تو ہمارے ہاں قدیم سماجی اقدار اور جدید شہری اقدار میں تفریق نمایاں ہے ہر دو طرف انتہا پسندانہ رویے تصادم کی صورتحال پیدا کرتے ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں اس صورتحال کو فہمیدہ ریاض نے ادبی تناظر کے ساتھ اپنی کتاب "ادب کی نسائی ردِ تشکیل" میں بیان کیا ہے۔ زیر نظر تحقیق میں موضوع کی نظری تفہیم کے لیے اس کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ مزید بر آں قاضی جاوید کی کتاب "اردو ادب اور تانیثیت" اور "فاطمہ حسن کی کتاب 'فیمنزم اور ہم، ادب کی گواہی" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

vi. تحقیقی طریقہ کار

زیر نظر مقالے میں خالدہ حسین کے افسانوی مجموعے "دروازہ"، "پہچان"، "مصروف عورت"، "ہیں خواب میں ہنوز"، "میں یہاں ہوں" پر انحصار کیا گیا ہے۔ دستاویزی اور بنیادی ماخذ تک رسائی کے لیے خالدہ حسین کے افسانوی مجموعے حاصل کیے گئے ہیں۔ بنیادی ماخذ تک رسائی کے بعد خالدہ حسین کی حالات زندگی اور شخصیت سے آگاہی کے لیے مختلف کتب اور دیگر ادیبوں کے ان سے لیے گئے انٹرویوز کو بھی شامل تحقیق کیا گیا ہے۔ انٹرویوز، تحقیقی رسائل و جرائد کے ساتھ ساتھ افسانوی مجموعوں اور نسائی مسائل کے حوالے سے

کتب کا مطالعہ بھی شامل تحقیق ہے۔ مزید کتب تک رسائی کے لیے سرکاری، جامعاتی اور نجی کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق

خالدہ حسین کے افسانوں میں ایم۔فل کی سطح پر "خالدہ حسین کی افسانوی نثر: ایک تجزیہ" بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے کام ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ "خالدہ حسین کے افسانوں میں اسلوب کا تنوع" کے عنوان سے بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان سے کام ہو چکا ہے۔ تاہم خالدہ حسین کے افسانوں میں نسائی مسائل: روایتی اور جدید سماجی تناظر میں تجزیاتی مطالعہ پر ایم۔فل کی سطح پر یہ موضوع نیا اور ہنوز تحقیق طلب ہے۔

viii. تحدید

خالدہ حسین کے ہاں موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے۔ تاہم زیرِ نظر تحقیق میں خصوصیت کے ساتھ ان کے افسانوں میں نسائی مسائل: روایتی اور جدید سماجی تناظر میں تجزیاتی مطالعہ ہی کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ دیگر موضوعات کا مطالعہ یا افسانوں کا فنی و فکری جائزہ اس تحقیق میں شامل نہیں۔

ix. پس منظری مطالعہ

اردو ادب کی روایت میں عورتوں کے مسائل کے متعلق بہت سے افسانے ملتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو میں افسانے کے آغاز ہی سے عورت موضوع رہی ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ منشی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور وغیرہ کے افسانوں میں عورت کے مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ بعد میں وقتاً فوقتاً عورت کے مسائل کے حل کو بھی پیش نظر رکھ کر ادب تخلیق کیا جانے لگا۔ پس منظری مطالعہ کے طور پر اردو افسانوی ادب میں عورت کے مسائل پر لکھے گئے افسانوں اور متعلقہ تنقیدی مواد سے استفادہ کیا گیا ہے۔

x. تحقیق کی اہمیت

خالدہ حسین موجودہ دور میں اردو ادب کے حوالے سے افسانہ نگاری میں ایک اہم نام ہیں۔ دیگر افسانہ نگاروں کی طرح ان کے ہاں بھی موجودہ دور کے مسائل کے مشاہدے کی صلاحیت موجود ہے۔انھوں نے اپنی تحریروں سے معاشرے میں نسائی مسائل کو اجاگر کیا اور مسائل کو جانچ کر اصلاح کی بھرپور کوشش کی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی تحریروں کے موضوعاتی تنوع کو سامنے رکھ کر تجزیہ کیا جائے اور ان کے کام پر مختلف جہات سے تحقیق کی جائے۔یہ مقالہ اسی سلسلے کی ایک کاوش ہے۔

ب) نسائی مسائل: روایتی اور جدید سماجی تناظر میں

نسائیت عورتوں کے خیالات و احساسات کا احاطہ کرتی ہے جو ان کے تجربات،مشاہدات،گھریلو پرورش اور ماحولیاتی جبر کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔نسائیت کے بنیادی تصورات میں یہ بات واضح ہے کہ بنی نوع انسان کے دو طبقے ہیں ایک عورت اور دوسرا مرد۔لیکن اس کے باوجود بھی مرد طبقہ عورت پر ظلم اور زیادتی کرتا چلا آرہا ہے۔صنفی اختلافات کی بنیاد پر کسی طبقے کو کمتر یا برتر قرار نہیں دیا جاسکتا۔لیکن نسائیت کے شعور سے پہلے معاشرے کے اندر مرد طبقے کو ہی برتری حاصل تھی۔فاطمہ حسن لکھتی ہیں:

> "نسائی ادب کی تحریک دراصل اس انسانی بیداری کی تحریک سے جڑی ہے جو عورت کی بنی نوع انسان حیثیت سے بنیادی حقوق کی بات کرتی ہے۔اور اس سماجی رویے کی مذمت کرتی ہے جس میں عورت کو شے سمجھا جاتا ہے اور اس کی تذلیل کی جاتی ہے۔"(۱)

معاشرے کے اندر کسی بھی فرد کے لیے اپنی شناخت اور تشخص قائم کرنا آسان نہیں ہوتا۔زندگی گزارنے کے لیے سماجی ضوابط، شخصی رویے، ملی اقدار اور ملکی قوانین کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔مختلف النوع کے پابندیوں کا شکار فرد جگڑ بندیوں کے باوجود زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا ہے۔عورت ان معاملوں میں مردوں کی نسبت بے بس، مجبور اور پایہ زنجیر ہوتی ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کے سماج،گھر اور اس کے وجود

کی تشکیل بھی مرد کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ عورت کے انفرادی وجود کی احساس اس کی ذات اور شخصیت کے بجائے ہوتی ہے۔ عورت کو اس ہی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے جو مردوں کے لیے فائدہ مند ہوتا ہے۔ عورت کو نیک پروین بنا کر باندی سے محبوبہ تک ہر کردار کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینا پڑتا ہے۔ مردانہ خواہشات کے مطابق ایک عورت کو ماں، بہن، بیٹی اور بیوی جیسے رشتوں میں مرد کے تابع رہنا پڑتا ہے۔

نسائیت نے خواتین کو مضبوط حوصلے اور اعتماد سے آگے بڑھنے کے راستے ہموار کیے۔ مردانہ معاشرہ کے اندر نسائی شعور کی وجہ سے خواتین اپنی ذات کی شناخت کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں: "فکری بنیادوں اور عملی تجاویز پر کام کرنے والی تحریک کو نسائیت کا نام دیا گیا۔"(۲)

نسائیت کوئی نظریہ یا تحریک نہیں ہے بلکہ نسائیت کئی نظریات اور تحریکات کے مجموعے کا نام ہے۔ اس حوالے سے مختلف تحریریں ملتی ہیں۔ ان میں تنویر انجم، فاطمہ حسن اور ڈاکٹر عصمت جمیل کی تحریریں شامل ہیں۔ تنویر انجم نے اس موضوع پر بعنوان "عصمت چغتائی کا نسائی شعور" کے عنوان سے مضمون لکھا جو "فیمنزم اور ہم ادب کی گواہی" میں شامل ہیں۔ اس مضمون میں نسائی تحریک اور نسائیت کی وجہ سے عورت کی حسیت پر سیر حاصل گفتگو کی گئی جو عورت کی حسیت سمجھنے میں اہم ہیں۔ نسائیت، نساء یعنی عورت سے متعلق کوئی بھی فعل یا خارجیت ہے۔ انسانی زندگی اور نسائیت کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ معاشرے میں ایک عورت کی حیثیت محض ایک چیز کی نہیں بلکہ ایک انسان کی ہے۔ نسائیت کی وجہ سے عورت کی انسانی حیثیت کو نہ صرف پہچانا گیا بلکہ اس کی تکمیل میں آنے والی روایتوں کو سمجھ کر ان کے خلاف عملی اقدام اٹھایا گیا اور حقوق نسواں کے لیے آواز بلند کی گئی۔ حقوق نسواں کی تحریک کے ذریعے ان تمام فرسودہ رسم و رواج کے خلاف عملی اقدام اٹھایا گیا لیکن جب یہ تحریک فکری بنیادوں کی تلاش میں عملی سرگرمیوں سے بڑھ کر نکلی تو یہ نسائیت کی تحریک بن گی۔

آزادی نسواں کا دوسرا نام نسائیت ہے۔ نسائیت عورتوں کے حوالے سے مثبت اپروچ کا اشارہ دیتی

ہے۔جب کہ آزادی نسواں منفی پہلو کو ابھارتا ہے۔ دونوں کے مقاصد یکساں ہے۔ عملی تجاویز اور فکری بنیادوں پر کام کرنے والی تحریک نسائیت کہلاتی ہے۔ عصمت چغتائی رقمطراز ہیں:

"انسانی زندگی اور نسائیت کا گہرا تعلق ہے۔ انسانیت اور نسائیت لازم وملزوم ہے۔۔۔ عورت کی انسانی حیثیت کی تکمیل کو پہچاننا اور معاشرے میں موجود انسانی حیثیت کی تکمیل میں رکاوٹ ڈالنے والی روایتوں کو سمجھنا اور ان کے خلاف عملی اقدام اٹھانا نسائیت یعنی feminisim ہے۔اس طرح نسائی شعور دراصل انسانی شعور ہے۔ چونکہ عورت کی بنیادی انسانی حیثیت سے انکار ایک غیر انسانی بات ہے اس لیے یہ کہنا درست ہو گا کہ نسائی شعور کے بغیر انسانی شعور ممکن نہیں۔"(۳)

درج بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ نسائیت اور انسانیت کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔نسائیت کی وجہ سے ہی مختلف روایتوں کو سمجھ کر ان کے خلاف عملی اقدام کیے جاتے ہیں۔ عورت اور مرد کے حوالے سے دیکھا جائے تو حیات کے یہ دو وجود ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں۔ حیات کی بقا اور تسلسل کا وسیلہ بھی ہے۔ تاریخ انسان میں کمزور افراد پر نہ صرف ظلم و تشدد ہوتا رہا ہے بلکہ کمزور افراد کے حقوق کو بھی پامال کیا گیا ہے لیکن نسائیت کی وجہ سے عورت اپنے مخصوص طرز فکر اور نسوانی نقطہ نظر کو معاشرے میں مطالعہ کرتی ہے اور دیکھتی ہے کہ خواتین کے انفرادی تجربات کس قسم کے ہیں۔ کشور ناہید لکھتی ہیں:

"عورت پیدا نہیں ہوتی بلکہ بنادی جاتی ہے۔۔ قیام پاکستان کے وقت کتنی ہی عورتیں ایسی تھیں جن کو خاندان والوں نے لینے سے انکار کیا۔۔۔ نسائی تحریک کو دوہرے دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک طرف تو عورت کا مثبت کردار پیش کرنا تھا یعنی معاشرتی شخصیت کے طور پر عورت کا مثبت کردار تو دوسری طرف مردوں کے بورزاوا کلچر کی منفی رجحان تھا۔۔"(۴)

اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کو دو مختلف جنس میں پیدا کیا۔ جسمانی ساخت کے حوالے سے دونوں میں فرق نمایاں ہے۔ مردوں کی طرح عورت بھی حاکمیت کی زندگی گزار رہی تھی لیکن نظام میں تبدیلی کی وجہ سے مرد معاشرے کے اندر حاوی ہو گیا۔ عورت صرف چار دیواری کے اندر ذمہ داریوں کو نبھانے لگی اور مرد

نے اپنا قبضہ جمالیا۔ خواتین پر اس قسم کی پابندی کی وجہ یہ تھی کہ عورتوں کو پردے میں رکھ کر اس کی عصمت کو محفوظ رکھا جانے لگا۔ معاشرے میں ایسی عورت کو اعلیٰ سمجھا جانے لگا جو چار دیواری کے اندر رہ کر اپنی پوری زندگی مردوں کی فرماں برداری اور مردوں کے بنائے ہوئے قواعد کے مطابق وقف کر دے۔ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش لکھتی ہیں:

> "معاشرے کی نیک پروین سے یہ توقع رکھی جاتی ہے وہ مرد کے لیے محبوبہ سے لے کر باندی تک ہر کردار کو خوشی خوشی اور خوش اسلوبی سے ادا کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو۔"(۵)

پدری نظام میں مردوں کو سخت جان، آزاد، خود مختار اور صاحب عقل سمجھا جاتا ہے جب کہ عورتوں کو جذباتی اور اطاعت پہ مائل ہو جانے والا۔ لڑکی کو خاندان والے فرمانبرداری اور قبول کرنے والی عادات سکھاتے ہیں۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ اختلاف رائے عیب ہے۔ جب کہ لڑکوں پہ مختلف اصول لاگو ہوتے ہیں انھیں اپنا دفاع خود کرنا سکھایا جاتا ہے۔ کھیل کود اور تفریح کا پورا موقع مہیا کیا جاتا ہے۔ جب کہ لڑکی کو شرمیلی اور چھوئی موئی بن کے رہنا پڑتا ہے۔

تحریک نسائیت کے حوالے سے مختلف تحریریں ملتی ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر قاضی عابد، ڈاکٹر خالد علوی، ڈاکٹر تنویر انجم اور ڈاکٹر عصمت جمیل کی تحریریں شامل ہیں۔ ڈاکٹر خالد علوی نے اس موضوع پر بعنوان "تحریک آزادی نسواں" کے عنوان سے مضمون لکھا جو کتاب "اسلام کا معاشرتی نظام" میں چھپا۔ اس مضمون میں تحریک نسائیت کے آغاز، نسائیت کے مسائل اور صنعتی انقلاب کے زمانے کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

تحریک نسائیت کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں مغرب سے ہوا۔ یورپ میں تب خواتین کو اس بات کا احساس ہوا کہ ان کی بھی معاشرے میں ایک حیثیت ہے۔ ایک انسان ہونے کے ناطے ان کے کچھ حقوق بھی ہیں۔ جبکہ معاشرے کے اندر حکمرانی صرف مردوں کی ہے۔ مرد خواتین کو ان کے حقوق سے محروم رکھ رہے ہیں۔ بیسویں صدی تک آتے آتے مردوں کے برابر جدوجہد پہلے سے زیادہ تیز ہو گی۔ اسلامی

معاشرے کی طرح یورپ کے اندر خواتین کی مردوں سے الگ سرگرمیاں نہیں رہیں۔ بلکہ ابتدا میں مغربی عورت کا کردار بھی صرف ایک گھریلو زندگی سے ہی متعلق تھا۔ معاشی نوعیت کا کردار صرف مرد ہی ادا کرتا تھا۔ انقلاب فرانس، صنعتی انقلاب اور صنعتی معاشرے کے قیام نے عورت کے کردار کو اور عورت کی سوچ کو بدلنے میں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا۔ صنعتی انقلاب سے پہلے برطانیہ میں مل جل کر رہنے، شادی اور خاندان جیسی رسومات کو اہمیت حاصل تھی۔ باہر کے تمام امور کی ذمہ داری مردوں پر عائد تھی اور عورتیں صرف گھر کی چار دیواری میں رہ کر کام کرتی تھیں۔

۱۷۵۰ء سے ۱۸۴۱ء تک برطانیہ میں صنعتی انقلاب کا زمانہ تھا۔ انقلاب کے زمانے میں عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ گھروں سے نکلیں۔ باہر ہوٹلوں، دفتروں، کارخانوں میں کمانے کے غرض سے حصّہ لیا۔ مذہب کے تصور سے آزادی اور مساوات جیسی قدریں مروج ہو گئیں۔ نکاح اور طلاق کی پابندیوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ عورتوں کی آزادی اور حقوق کے بارے میں فکری کشمکش ۱۸۵۰ء میں اپنے عروج کو پہنچی۔ تحریک نسائیت کی تحریک ابتدا میں عورتوں کی تحریک تھی جو بعد میں مطلق آزادی کی تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ اس تحریک نے عورتوں کو یہ احساس دلایا کہ عورتوں پر تمام تر مصیبتوں کی ذمہ داری ان کا اپنا ہی کردار ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کا ہے۔ ماؤں کے کردار کی وجہ سے عورتوں کو دوسرے درجے کی عورت سمجھا جانے لگا۔ ماؤں کو آزاد فرد تصور ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ تحریک نسائیت نے ہی عورتوں میں یہ احساس اجاگر کیا کہ خواتین مردوں کی طرح آزاد ہیں۔ اپنی زندگی آزادانہ طور پر بسر کر سکتی ہیں۔ مگر مغربی معاشرے کی عورتوں نے سب سے پہلے آزادی کی قیمت ادا کی۔ اس کے بعد ہی عورتوں نے گھروں سے نکلنا شروع کیا اور اپنا کیریر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ کیونکہ گھروں میں خواتین کبھی بھی اپنی استعداد اور صلاحیتوں کا لوہا نہیں منوا سکتی اور نہ ہی اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکتیں ہیں۔ ڈاکٹر فرزانہ کوکب لکھتی ہیں:

> " حقوق نسواں کے لیے نسائی تحریکوں کا آغاز اٹھارویں صدی کے نصف کے بعد ہوا۔ تحریک نسواں یا نسائی تحریک عورت کی حیثیت ور تمہت مساوی حقوق، آزادی

رائے کے حصول اور اسے مکمل انسان تسلیم کرنے کے نقطہ نظر کا احاطہ کرتی ہے۔"[۶]

نسائیت کے آغاز و ارتقا کے ضمن میں مختلف مکاتب فکر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مثلاً خالد علوی کی کتاب "اسلام کا معاشرتی نظام" میں بعنوان "نسائیت کے مکاتب" میں نسائیت کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں نسائیت کے تین مکاتب فکر کی وضاحت کی گئی ہے۔

۱۔ انقلابی نسائیت

۲۔ مارکسی و اشتراکی نسائیت

۳۔ لبرل نسائیت

انقلابی نسائیت کا نظریہ ماننے والے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ معاشرے کے اندر مرد ہی عورت کے استحصال کی وجہ ہے۔ کیونکہ عورت نہ صرف مردوں کی خدمت کرتی ہے بلکہ گھر کے کام کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی پالتی ہے۔ معاشرے کے اندر عورت کی حیثیت محکوم کی سی ہے اور مرد ہی معاشرے کے اندر حاکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ انقلابی تبدیلیوں کے باوجود بھی عورت استحصال کا شکار ہے۔ انقلابی نسائیت پسند رہنما کا خیال ہے کہ عورت کے استحصال کی بنیادی وجہ جنم دینے کی صلاحیت ہے۔ کچھ کے نزدیک جبری جنسی عمل مردوں کا عورتوں پر تشدد ہے جس کی وجہ سے مردوں کا عورتوں پر غلبہ رہتا ہے۔

انقلابی نسائیت پسند گروپ کا خیال ہے کہ صیح معنوں میں ہم جنس پرست خواتین ہی نسائیت پسند ہیں۔ کیونکہ ہم جنس پرست خواتین ہی مردوں کے بغیر آزاد ہیں۔ انقلابی نسائیت پسند اشتراکی طور پر اس بات سے اتفاق کرتے ہیں۔ معاشرے کو کسی ایک حاکمیت اور مظلومیت کو جارحانہ انداز میں پیش کیا گیا۔ عورت کی محرومی کی بنیادی وجہ جنسی استحصال ہے۔ کیونکہ حمل اور رضاعت کے دوران مرد پر انحصار عورتوں کا بہت زیادہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے عورت کے وجود اور بقا کا مسئلہ اُبھرتا ہے۔ مرد اپنے آپ کو گھریلو زندگی سے دور رکھتا ہے۔ گھر کے افراد اور بچوں سے اتنی ذاتی وابستگی نہیں رکھتا ہے جتنی عورت بحیثیت ماں سے توقع کی جاتی ہے۔ مرد کو سیاسی اور خارجی دنیا کی مذہبی رسوماتی سرگرمیوں کے لیے موزوں خیال کیا جاتا ہے

تنویر انجم رقمطراز ہیں:

"انقلابی نسائیت پسند، نسائیت کا وہ درجہ ہے جس میں اس بات کا کھلم کھلا اظہار کیا جاتا ہے کہ عورت کے مسئلے کا تعلق براہ راست پدری نظام اور معاشرے میں مرد کو برتری اور مراعات سے ہے ۔۔۔ انقلابی نظام کا نصب العین مرد سے براہ راست تصادم اور بغاوت کے ذریعے پدری نظام کی شکست اور مساویانہ حقوق کا قیام ہے"(۷)

خارجی دنیا مرد کو طاقت کے اظہار کا اعتماد اور صلاحیت کا اعتماد عطا کرتی ہے۔ مرد مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے اپنے اختیارات استعمال کرتا ہے اور عورت کو گھر میں مقید رکھا جاتا ہے۔ انقلابی نسائیت پسندوں کا خیال ہے کہ عورت کی کمزوری حیات ہے کیونکہ حیاتیات کی وجہ خارجی دنیا کی جفاکشی کی محتمل نہیں ہوتی ہے۔ حالانکہ عورت کی محکومی کا علاج فطرت کے خلاف نہیں بلکہ عادلانہ نظام میں ہے جس کی وجہ سے عورت کو بنیادی حقوق فراہم کیے جائیں۔

مارکسی اور اشتراکی نظام والے عورت کے استحصال کی ذمہ داری سرمایہ دارانہ نظام پر عائد کرتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں عورت کا بحیثیت ماں یا خاتون خانہ کے امور ہی اصل میں استحصال ہیں۔ کیونکہ تمام ذمہ داریوں کے باوجود ان کاموں کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ نسائیت پسند عورت کا استحصال تخلیق دولت میں دیکھتے ہیں۔ اُجرت والے کام اور کم فائدہ مند حیثیت کی وجہ سے عورتیں اختیارات سے محروم ہو گئیں۔ تنویر انجم رقمطراز ہیں:

"مارکسی نسائیت کی بنیاد مارکس اور اینگلز کے بنیادی فلسفہ خاندان پر ہے۔ اس کے مطابق انسانی تاریخ میں جب دولت کے حصّے کر کے انسان نے طبقات کی تشکیل کی تب ہی عورت کو بھی ایک چیز اور ایک جائیداد بنا دیا گیا۔ عورت سے وابستہ عزت کے تصوارت نے رواج پایا اور پدری نظام وجود میں آیا"(۸)

لبرل نسائیت پسندوں گروں کے ہاں کوئی خاص نظریہ موجود نہیں ہیں۔ جنسی مساوت کا حصول ان کا ہدف ہے۔ کیونکہ بعض با صلاحیت خواتین خاندان اور معاشرے کے لیے کوئی کردار ادا نہیں کر سکتیں۔

کیونکہ معاشرہ یا خاندان ان کو خدمت کا موقع ہی نہیں دیتا ہے۔ معاشرتی کردار نے عورتوں کے حوالے سے بے لچک اور محدود توقعات وابستہ کر لی ہیں۔ عورتوں کو معاشرتی امتیازات نے برابر کے مواقع سے محروم کر دیا ہے ۔ لبرل نسائیت پسند گروپ کا خیال ہے کہ صنفی عدم مساوات چونکہ معاشرے کے مفاد میں ہے لہذا معاشرے کے ہر فرد کو اسے دور کرنے کی جدوجہد میں خوش آمدید کہیں گے۔ جس کی وجہ سے معاشرے کے اندر خاص تبدیلیاں رونما ہو گئیں۔ تنویر انجم رقمطراز ہیں:

> "لبرل نسائیت کے علم برداروں کا مقصد بھی پدری نظام پر کوئی گہری ضرب لگا کر اسے توڑ دینا نہیں ہے بلکہ طبقہ کی اقدار کو اپنا کر ترقی کی راہ پر چلنا ہے۔ یہ لبرل نسائیت بھی دراصل انقلاب اور بنیادی تبدیلی کی نفی کرتی تھی۔"(۹)

تاریخ انسانی گواہ ہے کہ مرد کے ظلم و ستم ہمیشہ سے ہی عورت پر حاوی رہے ہیں۔ جمہوری نظام سیاست میں موجودہ دور کے اندر بھی کوئی آواز نہیں ہے نہ ہی عوامی نمائندگی کا حق ہے اور نہ ہی مردوں کے بنائے قوانین کے بغیر آزادانہ زندگی بسر کر سکتی ہے۔ جدید معاشرے کے اندر بھی شادی شدہ عورت زندہ درگور کی حیثیت رکھتی ہے۔ نسائیت کے شعور کے بعد عورتوں کو نہ صرف جمہوری نظام سیاست میں حق حاصل ہوا بلکہ آزادانہ طور پر اپنی مرضی کی زندگی بسر کر سکتی ہیں۔ آہستہ آہستہ خواتین اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہو گئیں۔ نسائی تحریک کی وجہ سے نہ صرف عورتوں کو آزادی کا حق حاصل ہوا بلکہ انھوں نے ادب کے اندر بھی اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کیا۔

پرانے تصور حیات کے اندر مرد پر کوئی پابندی نہ تھی۔ وہ آزاد تھا۔ اس حوالے سے مختلف تحریریں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، انیس ہارون اور ڈاکٹر سلیم اختر کی تحریریں شامل ہیں۔ پرانے تصور وحیات کے حوالے سے ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش کی کتاب "پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار" بعنوان مضمون "معاشرے میں عورت کا تصور" کی عکاسی کی گئی ہیں ۔ پرانے تصور حیات میں عورت ناقص العقل ہوتی تھی۔ فطرتاً مرد سے کم تر ہوتی ہے اور شوہر مجازی خدا ہوتا تھا۔ جدید تصور حیات جنس کی بنیاد پر کسی تفریق کا قائل نہیں۔ پرانے تصور حیات کے مطابق عورت کا مقدر مرد کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ عورت کی حیثیت صرف شے

کی ہوتی تھی۔ڈاکٹر سلیم اختر رقم طراز ہیں:

"عورت کا حسن اور جسمانی کشش اس کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ وہ شے ہوتی ہے جس کی قدر قیمت کا تعین منڈی کرتی ہے۔ فحاشی اور طوائف بازی کو اس نے جدید اور ترقی یافتہ ہونے کا معیار بنا دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ حقوق انسانی کے تحت انہیں قانونی تحفظات حاصل ہو جاتے ہیں۔ فیمنسٹ تحریک اس قسم کے میلان کے سخت خلاف ہے۔"(۱۰)

پرانے تصور حیات کے حوالے سے دیکھا جائے تو مرد پر کوئی پابندی نہیں ہوتی تھی صرف عورت پر ہوتی تھی۔ عورت آزاد نہیں تھی لیکن نسائی شعور کے بعد عورت بھی مرد کے ساتھ باوقار حیات کا تقاضا کر رہی ہے۔پہلے عورت کو جائیداد میں حق حاصل نہیں تھا اب تو وہ اپنی علیحدہ شناخت اور مساوی رتبے کا تقاضا کر رہی ہے۔نسائی شعور سے پہلے عورت کی پہچان باپ اور شوہر سے ہوتی تھی۔نسائی شعور کے بعد عورت اپنی شناخت اپنی ذات کے حوالے سے چاہتی ہے۔نسائیت کے شعور کے بعد اب عورت اپناوجود منانے کی تگ ودو میں ہے۔وہ خود مختار ہونا چاہتی ہے۔وہ اپنی شناخت خود بننا چاہتی ہے۔وہ مرد کی طفیلی نہیں بننا چاہتی ہے۔ وہ مرد سے مساوی حقوق کا تقاضا کر رہی ہے۔وہ اپنی حق کلیت چاہتی ہے۔وہ اپنی مرضی کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔وہ صرف بچے پیدا کرنے کی مشین نہیں بننا چاہتی ہے۔

نسائی شعور سے خواتین اپنی ذات کی شناخت کر رہی ہیں۔ تاریکیوں سے نکل کر اپنی الگ پہچان بنا رہی ہیں۔بے جا رسومات اور چار دیواری سے آزاد کھلی فضا میں اپنے حق کا لوہا منوا رہی ہیں۔پرانی نسائیت کو نئی جہات سے روشناس کروا رہی ہیں۔نسائی شعور کی وجہ سے جو پہچان مردوں کو تھی وہ آج خواتین کی ہو رہی ہے۔ انہیں آج بھی سماج میں روایتی قدر حاصل ہے۔ جیسے ضرب الامثال اور لطیفوں کے ذریعے خواتین کا خاص تصور ہیں۔ ظلم وزیاتی اور مرد کے اقتدار کے باوجود ہار قبول نہ کی۔وہ ہر وقت امتحان کی تیاری میں لگی ہوتی ہیں اپنی بقا کی جنگ زندگی کے ہر لمحے میں لڑتی رہی ہیں۔ مرد غالب معاشرہ ہونے کے باوجود بھی ان کی روایات و ماحول میں انہوں نے بڑی خاموشی سے اپنی پہچان بنائی جو آج زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہیں۔

ج) نسائیت اور تانیثیت میں فرق:

نسائیت اور تانیثیت کی اصطلاحوں میں واضح فرق موجود ہے۔ اس فرق کی وضاحت ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کی کتاب "کشاف تنقیدی اصطلاحات" سید دہلوی کی فرہنگ آصفیہ اور نور الحسن کی نورالغات میں ان کی مختلف تعریفوں کے ذریعے کیا گیا ہے۔ ترنم ریاض نے بھی اپنے مضمون "نسائیت اور تانیثیت" میں اس فرق کی وضاحت کی ہے۔ڈاکٹر عظمیٰ فرمان نے بعنوان "نسائیت " میں نسائیت اور تانیثیت کی دو مختلف اصطلاحات کے درمیان واضح فرق کی وضاحت کی ہے۔ عام طور پر نسائیت اور تانیثیت کو ایک ہی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ فیمنزم کا ترجمہ نسائیت اور تانیثیت کے الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں اصطلاحوں کے درمیان واضح فرق موجود ہیں۔اسی فرق کو سمجھنے کے لیے نسائیت اور تانیثیت کی وضاحت ضروری ہے۔نسائیت اور تانیثیت کی متعدد تعریفیں ہیں۔ نسائیت کی واضح تعریف کشاف تنقیدی اصطلاحات میں یوں ہے:

> "عورتوں کے مخصوص محاورات و اصطلاحات اور نسوانی جذبات و احساسات کو شعر میں شامل کرنا، اصطلاح میں نسائیت کہلاتا ہے۔ ریختی میں نسائیت کا عنصر بنیادی اہمیت رکھتا ہے"(۱۱)

جمیل جالبی کی لغت "قومی انگریزی اردو لغت" میں نسائیت کے معنی یوں ہیں:

> "feminety عورت پن، زنانہ پن، نسائیت، نسوانیت"
>
> "feminine عورت یا صنف نازک سے متعلق، نسائی خصائص لیے ہوئے (گرامر مونث) وہ لفظ جو حالت تانیث کو ظاہر کرے"(۱۲)

"فرہنگ آصفیہ" میں تانیثیت کے لغوی معنی یوں ہیں:

> "تانیثیت اسم مونث تذکیر کا تقیض مونث ہونا"(۱۳)

"نور الغات" میں تانیثیت کے لغوی معنی یوں ہیں:

"تانیثیت۔ مونث بنانا۔ مونث کرنا۔ مونث۔ عورت۔ مونث۔ تذکیر کی تفیض
مونث کی علامت لگانا"(۱۴)

"جامع اللغات" میں تانیثیت کے لغوی معنی یوں ہیں:

"تانیثیت۔ (ع) مونث۔ مونث۔ مونث کی علامت انت مادہ ہونا"(۱۵)

تانیثیت عورتوں کے حقوق اور مفاد کے لیے کام کرنے والی ایک جدید تحریک ہے۔ ڈاکٹر عظمیٰ فرمان نے اپنے مضمون "نسائیت ایک تعارف" میں اس پر سیر حاصل گفتگو کی ہے کہ تحریک نسواں، حقوق نسواں، نسوانیت، تانیثیت نسائیت کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہ دراصل ایک ایسی تحریک ہے جو عورتوں کے مساوی حقوق کی بات کرتی ہے۔ یہ سیاسی تحریک ہے اور سیاسی تحریک ہونے کے ساتھ ساتھ تانیثیت ایک نظریاتی وابستگی بھی ہے۔ عورت کے جنسی امتیاز کے خاتمے کا نام تانیثیت ہے جو عورتوں کے لیے انصاف اور صنفی امتیازات کے خاتمے کے لیے کوشاں ہے۔ یہ انداز فکر اور فلسفہ حیات کا نام ہے۔ سماج کے اندر عورت کو ابتدا ہی سے بہت سے مسائل کا سامنا رہا ہے۔ پدرانہ نظام میں عورتوں پر مختلف پابندیاں عائد کر دی جاتی تھیں جن میں مساوی حقوق، سماجیاتی ناہمواریاں، جنسی جبر، قانونی عدم تحفظ اور فرسودہ روایت وغیرہ تھیں اور ایک اہم مسئلہ نسائی تشخص بھی تھا، جن کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن تانیثیت کی بدولت عورتوں کے اندر شعور پیدا ہوا۔ ترنم ریاض اپنے مضمون نسائیت اور تانیثیت کو دو مختلف پہلوں مانتے ہوئے لکھتی ہیں:

"میری نظر میں وہ تجربات خیالات اور احساسات جو خواتین کی جسمانی ساخت، گھریلو
ماحول اور مخصوص پرورش کا نتیجہ ہیں نسائیت کے زمرے میں شمار کیے جاتے ہیں اس
کے برعکس تانیثیت حیاتیاتی جبر کو ماننے سے انکار کرتی ہے۔"(۱۶)

تانیثیت کے حوالے سے مختلف ممالک میں بہت سی کی تحریکات برپا ہوئیں۔ ان تحریکات کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر رشید امجد نے "پاکستانی ادب ۱۹۹۴ء حصّہ نثر" میں سیر حاصل گفتگو کی ہے اور تانیثیت نے تمام زبانوں کے عالم ادبیات کو متاثر کیا۔ تانیثیت ایک ایسی تحریک تھی جس نے عالمی ادبیات کو

متاثر کیا۔ ظلم و ستم اور معاشرے میں موجود ناانصافیوں کے خلاف اٹھنے والی آواز کا نام تانیثیت ہے۔ تانیثیت کو دراصل عورتوں کے ساتھ اس لیے مخصوص طور پر جوڑا گیا ہے کیونکہ ابتدا میں عورتوں کوئی حق نہیں تھا۔ عورتیں ظلم و ستم کا شکار تھیں۔ عورتوں کے حقوق کی یہ تحریک مغرب سے شروع ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس تحریک نے زبردست شہرت حاصل کی۔ بلاشبہ یہ عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والی تحریک ہے۔ ڈاکٹر عظمٰی فرمان اپنے مضمون "نسائیت" میں لکھتی ہیں:

"فیمنزم عورتوں کے حقوق اور مفادات کے لیے کام کرنے والی تحریک ہے۔"(۱۷)

نسائیت کا تعلق عورتوں سے ہوتا ہے۔ اس حوالے سے مختلف تحریریں ملتی ہیں مثلاً ڈاکٹر حمیرہ سعید نے "اردو ناولوں میں نسائی حسیت" میں اس کی واضح وضاحت کی ہے کہ نسائیت سے مراد خالص عورتوں کا ادراک، ان کے خیالات، جذبات، احساسات، قوت تخیل اور حسیت کا نام ہے جو صرف عورتوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ مردوں کے اندر نہیں پایا جاتا کیونکہ مرد عورت کی طرح نہیں ہوتے ہیں۔ مردوں کا حسیت تخیل اور احساس عورت سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ نسائیت کا تعلق صرف عورتوں سے ہوتا ہے۔ نسائیت ایک رجحان ہے۔ ایک داخلی، ذہنی اور باطنی احساس کا نام نسائیت ہے۔ حمیرہ سعید یوں لکھتی ہیں:

"نسائی حسیت ایک رجحان ہیں ایک داخلی قرینہ، ایک ذہنی رویہ، ایک باطنی احساس کا نام ہے۔ جس کا نسوانیت سے کوئی ربط نہیں ۔ بلکہ طبقہ اناث کے احساس سے ہے۔ مرد میں نسوانیت ہو سکتی ہے۔ نسائی حسیت نہیں۔ کیونکہ وہ عورت کی طرح نہ دیکھ سکتا ہے اور نہ محسوس کر سکتا ہے۔"(۱۸)

نسائیت ایک رحجان ہے، ایک داخلی، ذہنی اور باطنی احساس کا نام نسائیت ہے۔ مرد میں نسوانیت ہو سکتی ہے۔ نسائی حسیت نہیں کیونکہ مرد عورت کی طرح نہ محسوس کر سکتا ہے اور نہ ہی دیکھ سکتا ہے۔ نسائیت کا تعلق صرف اور صرف عورتوں سے ہے۔ نسائیت عورتوں کے خیالات اور احساس کا احاطہ کرتی ہے۔ گھریلو پرورش اور ماحولیاتی جبر کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کو اجاگر کرتی ہے۔ نسائیت کا تعلق باطنی احساسات اور خیالات کو نسائیت کے ذریعے ہی احاطہ تحریر میں لایا جاتا ہے

حمیرہ سعید رقمطراز ہیں:

"نسائی حسیت کا تعلق صرف اور عورت سے ہے جو کہ اس کے اثبات، وجود، داخلی شناخت و پہچان اور صفات کی بنا پر ہوتا ہیں۔ اس طرح نسائی حسیت ایک باطنی احساس کا نام ہے۔ صیح معنوں میں اس کا اظہار عورت کی جانب سے ہی ہو سکتا ہیں۔ مرد جب بھی نسائی حسیت کو پیش کرنا چاہیے گا۔ اس کا روایہ ہمدارانہ ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ بالکلیہ طور پر نسائی حسیت کے اظہار پر قادر نہیں ہو سکتا۔"(۱۹)

درج بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ نسائیت کوئی تحریک نہیں ہے اور نہ ہی کوئی رجحان ہے بلکہ نسائیت کے ذریعے خواتین کی سوچ، احساس اور جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ کس جذبے کے ساتھ معاشرے کو دیکھتی ہے نسائیت اور تانیثیت کے درمیان ایک واضح فرق موجود ہے۔ نسائیت کی وضاحت حمیدہ معین رضوی یوں کرتی ہیں:

"نسوانیت کا مطلب وہی ہے جو مردانہ پن مردوں کے لیے ہے۔ یہ نسبت ہیں بنت حوا سے۔ کوئی عورت کتنی ہی جائل ہے۔ کسی بھی رنگ سے اس کا تعلق ہو۔ اس کا کوئی مذہب یا ذات ہو۔ اس کی ہر حرکت جو خواتین سے مختص ہے۔ نسوانیت کہلائے گی۔"(۲۰)

تانیثیت کے حوالے سے حمیدہ رضوی لکھتی ہیں:

"خواتین کے اپنے تجرباتی، واقعاتی، معاشرتی، معاشی اور لاشعور حقائق کو سمجھنے برتنے اور اظہار کرنے کو فیمینسٹ ادیبوں نے نسائی نظریہ ادب کا نام دیا ہے۔"(۲۱)

نسائیت ہر عورت کا خاصہ ہے اور وسیع اصطلاح ہے۔ تانیثیت ایک شعوری تحریک ہے جو یورپ میں خواتین نے اپنے حقوق کے لیے شروع کی۔ یہ نسائیت کی ایک شاخ کہی جاسکتی ہے۔ نسائیت احساسِ عورت ہے۔ تانیثیت دوسروں کو عورت ہونے کا احساس دلانے کا عمل ہے۔

نسائیت، نساء یعنی عورت کے حوالے سے کوئی فعل ہے۔ عام طور پر نسائیت کے لیے عورت یا لڑکی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جب کہ تانیثیت خواتین کے خلاف کیے جانے والے اقدامات کا ایک رد عمل

ہے۔ قانونی تحفظ کا احساس جب اُبھرا تو یہی احساس تحریک کے قالب میں ڈھل کر فیمنزم یا نسائی نظریہ کی صورت اختیار کر گیا۔ عورت اپنے مخصوص طرز فکر اور نسوانی نظر سے معاشرے کو دیکھتی ہے۔ مرد اور عورت دو مختلف جنس میں پیدا ہوئے ہیں۔ جسمانی اعتبار سے بھی واضح فرق موجود ہے۔ عورت کی معاشرے میں بطور انسان کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ہر طرح کی پابندیوں کا سامنا تھا۔ پروفیسر اصغر عباس رقم طراز ہیں:

> "انیسویں صدی میں عورتوں کے استحصال کا مسئلہ کافی پیچیدہ ہو چکا تھا۔ لیکن اس تحریک کی دانشمندانہ رہنمائی نے جلدی ہی ایک ایسا حلقہ پیدا کر دیا جس نے عورت کی حیثیت اور اس کے حقوق کے بارے میں نظر ثانی کی مانگ کی۔ اس طرح عظمت نسواں کے لیے اساس فراہم ہوئی۔"(۲۲)

انیسویں صدی سے پہلے تک عورتوں کو کوئی حق حاصل نہیں تھا اور نہ ہی آزادانہ طور پر اپنی مرضی کی زندگی گزار سکتی تھیں۔ انیسویں صدی میں ابھرنے والے اس تحریک نے خواتین کو بھی احساس دلایا کہ وہ معاشرے کے اندر ایک زندہ وجود رکھتی ہیں۔ ان کی حیثیت مردوں کے برابر ہے۔ یہ تحریک خواتین کے اندر یہ شعور پیدا کرنے کا باعث بنی ہیں کہ معاشرے کے اندر عورت کی حیثیت ایک شے کی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک انسان ہے۔ مردوں کے برابر حقوق رکھتی ہے۔ یہ تحریک عظمت نسواں کے لیے ایک اساس کا باعث بنی ہے۔ تانیثیت اور نسائیت ایک سماجی تحریک ہے جو عورتوں کے مساوی حقوق کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔

تانیثیت کا لفظ ابتدا میں نسوانی خصوصیات کے لیے استعمال ہوا لیکن بعد میں اس اصطلاح نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ تانیثیت مختلف نظریات کی حامل ایک تحریک ہے۔ تانیثیت کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ خواتین کو مردوں کے برابر کے حقوق مہیا کیے جائیں۔ جبکہ نسائیت اور انسانی زندگی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ عورت کی حیثیت چونکہ معاشرے کے اندر ایک انسان کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اور نسائیت آپس میں لازم وملزوم ہے۔

ڈاکٹر تنویر انجم لکھتے ہیں:

"انسانی زندگی اور نسائیت کا گہرا تعلق ہے۔ انسانیت اور نسائیت لازم وملزوم ہیں۔۔۔ عورت کی انسانی حیثیت کو پہچاننا اور معاشرے میں موجود اس انسانی حیثیت کی تکمیل میں رکاوٹ ڈالنے والی روایتوں کو سمجھنا اور ان کے خلاف عملی اقدام اٹھانا نسائیت ہے۔ نسائی شعور دراصل انسانی شعور ہے۔"(۲۳)

نسائیت معاشرے میں موجود روایتوں کو سمجھ کر ان کے خلاف عملی اقدام اٹھاتی ہے تاکہ عورت معاشرے میں روایتوں سے آزاد ہو کر آزادانہ طور اپنی زندگی بسر کر سکے۔ بطور انسان اپنی حیثیت کو پہچان کر اپنی زندگی بسر کر سکے۔ جبکہ تانیثیت پدری سماج کے اصولوں کا خاتمہ کر کے ایک نئے معاشرے کو پیدا کرتی ہے۔ تانیثیت کا مقصد دراصل خواتین کی صلاحیتوں کو نکھارنا ہے، ان میں جستجو پیدا کرنا ہے۔ عورتوں کے جائز آزادانہ حقوق کی بحالی، نسائی خوشحالی اور ترقی کے افق کی مشکلات کو نیست ونابود کرنا تھا۔ تانیثیت کی تحریک کا اصل مقصد علم نشریات، عمرانیات، معاشیات، ادب فلسفہ، جغرافیہ ہو یا نفسیات ہر شعبوں میں نسائی حقوق کی مساوات حاصل ہو۔ تاکہ انسانیت کی توہین، تضحیک اور بے توقیری کرنے والے چہرے سے نقاب اٹھایا جا سکے۔ سماج میں بڑھتے ہوئے جنسی جنون اور پہچان کا خاتمہ کرنا تانیثیت کی تحریک کا مقصد تھا۔ اخلاقی بے راہ روی کو مٹا دینا، مساوی حقوق کی وکالت اور عورتوں کو انصاف مہیا کرنا سب اس تحریک کے زمرے میں آتا ہے اور اس تحریک کا مقصد عورتوں کے لیے انصاف اور معاشرے سے جنسی یا صنفی امتیازات کے لیے کوشاں ہے۔ ڈاکٹر عظمیٰ فرمان لکھتی ہیں:

"عالمگیریت کے اس عہد میں کوئی علم، فن یا نظریہ ایسا نہیں ہے جس کا تعلق دیگر علوم وفنون سے استوار نہ ہو۔ فیمنزم بھی ایک دبستان فکر ہے جس کا اثر تمام شعبہ ہائے زندگی پر نظر آتا ہے۔۔۔ فیمنزم کی کئی شاخیں وجود میں آچکی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بڑی تقسیم اس بحث کے نتیجے میں سامنے آتی ہے کہ آیا عورت پیدا ہوتی ہے یا بنا دی جاتی ہے۔"(۲۴)

تانیثیت کی تحریک کا مقصد عورتوں کو ان کے اصل حقوق مہیا کرنا ہے۔ جس طرح عالمگیریت کے علم کا اثر تمام علوم پر پڑتا ہے اسی طرح تانیثیت کا اثر زندگی کے تمام شعبے پر پڑتا ہے۔ تانیثیت کے ذریعے اس پہلو کو اجاگر کیا جاتا ہے کہ معاشرے کے اندر عورت کو عورت بننے پر معاشرہ ہی مجبور کرتا ہے۔ کیونکہ پیدائشی طور پر عورت اتنی کمزور نہیں ہوتی ہے جتنا معاشرے کی بے جا پابندیاں اسے کمزور بنا دیتی ہیں اور معاشرے میں عورت کی حیثیت ایک شے کی مانند تصور کی جاتی ہے۔ جدید خیالات اور نئے زمانے کی آمد ہوئی تو اس دور کی عورت کو بحیثیت انسان سمجھنے کا احساس ہوا۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت کے اندر عورتوں اور جانوروں میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ جب شعور آنا شروع ہوا تو عورتوں کو بھی مردوں کے برابر حقوق دلانے کا احساس ہوا۔ اس حوالے سے تانیثیت کی تحریک نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ صغرا مہدی لکھتی ہیں:

> "جدید خیالات اور نئے زمانے کی آمد سے عورتوں کی خراب حالت کا احساس لوگوں کو ہونا شروع ہوا۔ اور دنیا بھر میں عورتوں کی آزادی اور ان کو مردوں کے برابر سمجھنے کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ آزادی نسواں کے لیے انگریزی میں لفظ فیمنزم استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ سترہویں صدی میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ اور اس کی توجہیں اور اس کا مطلب الگ الگ وقتوں اور ملکوں میں الگ لگ کیے گئے۔۔۔ ابتدا میں اس کا تصور محدود تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں وسعت آتی گئی۔"(۲۵)

تانیثیت عورتوں کی آزادی کے حوالے سے ایک تحریک ہے۔ جس میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دلانے کی جانب توجہ مرکوز کی گئی۔ جبکہ نسائیت کوئی باقاعدہ تحریک نہیں ہے بلکہ کئی تحریکات کے مجموعے کا نام ہے۔ نسائیت کی اصطلاح لڑکیت اور اور عورتیت کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ نسائیت کے ذریعے عورتوں پر ہونے والے ظلم کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ ماحولیاتی جبر اور گھریلو پرورش کے ذریعے مسائل کا احاطہ کیا جاتا ہے۔

شاہدہ حسن لکھتی ہیں:

"نسائیت سے مراد صرف عورتوں کے ساتھ ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانا ہی نہیں ہے۔ بلکہ عورت کا ایک مخصوص طرز احساس اور طرز اظہار بھی ہے۔"(۲۶)

نسائیت عورتوں کے مخصوص طرز اظہار کا طریقہ ہے۔ عورتوں کے احساسات، جذبات اور ان کے خیالات کی ترجمانی نسائیت کے ذریعے کی جاتی ہے۔ بحیثیت انسان سمجھتے ہوئے عورت کی انسانی شناخت کو اہمیت دینا نسائیت کا مقصد ہے۔ عورتوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانا بھی نسائیت کا مقصد ہے۔ عورتوں کے طرز احساس اور طریقہ اظہار کو بھی مخصوص پیرائے میں بیان کرنا نسائیت کا مقصد ہے۔ تنویر انجم رقمطراز ہیں:

"عصمت کا مقصد عورت کے لیے اس جنسیت کی تلاش ہے جس میں اس کی انسانی حیثیت کا اثبات ہوتا ہو۔ جنسی شناخت ہر عورت کے لیے اس کی انسانی شناخت کا ایک اہم جزو ہے۔"(۲۷)

نسائیت اور تانیثیت کے درمیان ایک واضح فرق موجود ہے۔ تانیثیت باقاعدہ ایک جدید تحریک ہے جبکہ نسائیت نہ ہی کوئی تحریک ہے اور نہ ہی کوئی نظریہ ہے بلکہ نسائیت کئی تحریکات کے مجموعے کا نام ہے۔ نسائیت عورتوں کے خیالات واحساسات کا احاطہ کرتی ہے جو ان کے تجربات، ماحولیاتی جبر اور گھریلو پرورش کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں۔ جبکہ تانیثیت ایک جدید تحریک ہے جو صنف کی بنیاد پر جبر کو نہ صرف رد کرتی ہے بلکہ معاشرے کی اس ذہن سازی کو بھی رد کرتی ہے جو عورت کو کمتر گردانتے ہیں۔

(د) برصغیر کے روایتی سماجی تناظر میں معاش، جنس اور شناخت کے مسائل:

برصغیر پاک وہند کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا تھا۔ اس حوالے سے مختلف تحریریں ملتی ہیں۔ مثلاً تنویر انجم کا مضمون "عصمت چغتائی کا نسائی شعور" اور قاضی عابد کی "اردو ادب میں تانیثیت" میں عورت کے حوالے سے روایتی تصور پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے کہ ہزارہا سال گزرنے کے باوجود ایشیائی معاشرے میں پدرسری نظام کی فرسودہ روایات اثرپذیر ہے۔ آج بھی عورت کے حوالے

سے روایتی تصور ہمارے ذہنوں میں ہے۔ ہندوستانی عورت مظلومیت اور بچارگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ستی کی رسم نے ہندوستانی عورت کو موت کی بھینٹ چڑھایا اور مسلمان عورت بیوہ عقد ثانی کے حق سے محروم کر دی گئی۔

برصغیر پاک وہند میں دو تہذیبوں کا ملاپ تھا۔ ہندو جو تعداد میں زیادہ تھے۔ جبکہ مسلمان تعداد میں کم تھے۔ عورت کے مقام کا تعین بھی مختلف مذاہب میں کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے اندر مغلوں کی حکومت تھی۔ مغلوں کی وجہ سے ان کی بیگمات اور شہزادیوں کو عام عورت کی نسبت سے بہت سے حقوق حاصل تھے۔ شہزادیوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر تمام سہولیات میسر کی جاتی تھی۔ عقیلہ جاوید لکھتی ہیں:

> "جہاں تک دور مغلیہ میں تعلیم نسواں کی ترقی کا حال ہے۔ نو سے دس سال کی عمر تک کی لڑکیاں مکاتب میں جا کر پڑتی تھیں۔ اس کے بعد گھروں میں تعلیم کا سلسلہ شروع کیا جاتا تھا۔ جس کے لیے کوئی پڑھی لکھی شریف خواتین کسی گھر میں مکتب کھول سکتی تھیں۔"(۲۸)

عورت کا یہ مقام ہندوستانی معاشرے کا ایک طرفہ رخ تھا۔ کیونکہ عام عورت اور طبقے کی عورت کے لیے معیارات بہت مختلف تھے۔ ہندو دھرم میں عورت کی حالت زار قابل رحم تھی۔ کیونکہ ابتدا میں بچیوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جاتا تھا اور ایک سوگ کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ بہت ہی کم عمری میں شادیاں بڑی عمر کے مردوں سے شادی، ستی کی رسم، بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت نہ دینا جیسے مسائل کا سامنا ہندو عورت کو ابتدا ہی سے رہا۔ ہندوستانی معاشرے کے اندر خاندانی نظام بہت مضبوط تھا۔ خاندانی نظام میں عورت مختلف روپ میں اپنا فعل سرانجام دیتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ کبھی ماں، بیوی، بہن، بیٹی کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ ایسے خاندانی نظام کی وجہ سے بہت سی رسم ورواج، تہذیب اور طرز رہن سہن کی وجہ سے ہی عورت کو مختلف طریقوں سے استحصال کا سامنا رہا ہے۔

عورت کو پردے میں رکھنے کا رواج، تعلیم سے محروم رکھ کے چار دیواری میں مقید کرنے کا رواج، گھر گرہستی اور نسلی بقا کی ضامن ٹھہرا دیا گیا تھا۔ اپنی مرضی سے کوئی بھی عورت اپنی زندگی نہیں گزار سکتی

تھی۔ دنیا میں دیگر مذاہب کی نسبت سب سے پہلے اسلام نے ہی عورت کو بنیادی حقوق فراہم کیے۔ اس حوالے سے مرتضیٰ علی اطہر نے اپنی کتاب " فہمیدہ ریاض کی شاعری میں جدید عورت " پر اس میں حاصل گفتگو کی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عورت کی حیثیت ایک بے جان شے کی مانند تھی۔ مردوں کے سامنے عورت کی حیثیت صرف دلچسپی کے سامان کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھی۔ ڈاکٹر مرتضی علی اطہر لکھتے ہیں:

> "زمانہ جاہلیت میں خطہ عرب میں عورتوں کی حیثیت ایک بے جان شے اور مردوں کی دلچسپی کے سامان کے علاوہ زیادہ کچھ نہیں تھی۔ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ شادی اور عقد کے سلسلے میں اس وقت تک نہ کوئی قوانین وجود میں آئے تھے اور نہ ہی ایسی شرائط واضح ہوئی تھیں۔ جو عورتوں کی خرید و فروخت پر قابو پانے میں معاون ہو پاتیں "(۲۹)

عورت کو اسلام نے بہت سے حقوق سے نوازا ہے۔ لیکن ہندوؤں کی قربت کی وجہ سے عورت کے حوالے سے تنگ نظری چند مسلمانوں میں بھی در آئی تھی۔ برصغیر کی تقسیم نے پدرسری خاندان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ مجموعی طور پر تقسیم ہند نے عورت کو نئے امکان اور نئے چیلنج سے دوچار کیا۔ زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

> "برصغیر کی تقسیم نے پدری خاندان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔۔۔ پردہ جو مسلم خاندانی نظام کا ایک بنیادی ستون تھا۔ اس میں بھی دراڑ پڑ گئیں۔ معاشی ضرورتوں کے تحت عورتوں کا گھروں سے باہر نکلنا، لڑکیوں کی تعلیم حاصل کرنا اور متحرک ہونا انہیں گھر کے دائرے میں قید کر کے رکھنے والوں کے لیے ناگزیر ہو گیا۔۔"(۳۰)

بحیثیت مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والی عورت بے بسی کی عملی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ مرد عورت کا مجازی خدا، آقا، مالک اور حاکم تھا اور عورت مرد کے بنائے گئے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتی ہیں۔ اس کا اپنی زندگی پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ اپنی مرضی سے سانس لینے کا بھی اختیار نہیں ہوتا ہے۔ نہ ہی اپنی خواہشات کے لیے لڑ سکتی ہیں اور نہ ہی فرسودہ رسم و رواج سے بچ سکتی ہیں۔ مردوں

کی بالادستی والے معاشرے میں عورت کی حیثیت ایک شے سے کم نہیں ہوتی تھی۔

تانیثیت کی تحریک جب اُبھری تو عورتوں کے اندر شعور اجاگر ہوا۔ عورتوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی اور اپنی انفرادی صلاحیت منوانے کا جذبہ پروان چڑھایا۔ اس حوالے سے سے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے "اردو میں تانیثیت کی تحریک" میں مختلف نامور رسائل اور ان کی ادیبوں کی وضاحت کی ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں عورتوں کے اندر اپنی انفرادی صلاحیت منوانے کا جذبہ پیدا ہوا۔ چند نامور ادبی رسائل نے عورتوں کو اس دور کے اندر آزادی دی۔ شیخ عبداللہ کا ماہنامہ "خاتون" اور علامہ راشد الخیری کے رسالے "عصمت" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ہفت روزہ "تہذیب نسواں" جس کے بانی ممتاز علی تھے۔ یہ نمایاں رسائل تھے جنہوں نے عورت کی آزادی اور انفرادی صلاحیت اور حقوق کے حوالے سے آزادنہ طور پر لکھا۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

> "خواتین کے مسائل پر پہلی بار قلم اٹھانے والی خواتین ہی ہیں۔ لاہور سے محمدی بیگم نے ۱۸۹۸ء میں خواتین کا رسالہ "تہذیب نسواں" جاری کیا۔ جس کا مقصد خواتین کے شعور کی بیداری اور اپنے مسائل سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت کا اظہار تھا۔ ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ سے نکلنے والا رسالہ "خاتون" اور ۱۹۰۸ء میں دہلی سے جاری ہونے والا "عصمت" بھی کم و بیش انھی مقاصد کا علمبر دار تھا"[۳۱]

خواتین کے حقوق سلب کرنے والی رسومات اور معاشرتی قوانین کے خلاف سب سے پہلے عورتوں نے آواز بلند کی۔ خواتین کے حقوق اور ان کے حصول کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والی رکاوٹوں کو تحریری طور میں بیان کیا۔ بیسویں صدی میں بہت سی ادبی اور سیاسی تحریکیں بہت جوش و خروش کے ساتھ اُبھریں۔ اس دور کے اندر عورت کے مقام اور حیثیت میں ایک نمایاں فرق موجود تھا۔ تانیثیت کی تحریک کی وجہ سے عورتوں کو بہت سے حقوق بھی مل گئے۔ مگر ان سب کے باوجود بھی عورت مختلف مسائل میں گھیری ہوئی نظر آتی ہے۔

تحریک آزادی میں خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ جن میں مادرِ ملت فاطمہ جناح، محترمہ رعنا لیاقت

علی خان اور بیگم سلمی تصدق وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ مسلمان عورتوں نے برصغیر کے کونے کونے سے تحریک آزادی میں حصّہ لیا۔ طویل جدوجہد میں مسلم خواتین نے مردوں کے شانہ بشانہ مل کے کام کیا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کا اہم ترین واقعہ پیش آیا۔ قیام پاکستان کی وجہ سے ہندوستان دو مختلف تہذیبوں، ثقافتوں اور مذاہب کے ماننے والوں میں منقسم ہو گیا۔ قیام پاکستان کا مرحلہ بہت سی کوششوں کے باعث معرض وجود میں آیا۔

پاکستانی معاشرے میں بیگم رعنا لیاقت علی خان نے سب سے پہلے عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے پہلا قدم اٹھایا۔ ویمن والنٹری سروس کے نام ۱۹۹۸ء میں ایک ادارہ قائم کیا۔ جس کا مقصد جذباتی و اخلاقی وسائل فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ صحت کے وسائل فراہم کرنا شامل تھا۔ عورتوں کے حقوق کی ذیل میں "اپوا" All Pakistan Women Association کا قیام ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء کو عمل میں آیا۔ اس تنظیم کا مقصد خواتین کو سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تعلیمی تحفظ فراہم کرنا تھا۔ پاکستان میں عورتوں کو مختلف حقوق سے نوازا گیا، جس کی بدولت ان میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر عقیلہ جاوید لکھتی ہے:

> "اپوا کے مقاصد میں عورتوں کے عمومی شعور کو اجاگر کرنا تھا کہ وہ سماجی قانون کے بارے میں مکمل معلومات رکھیں۔ خصوصاً دیہی عورت جو اپنے گھر اور زرعی پیداوار کے میدانوں میں بلامعاوضہ کام کرتی ہے۔ اس کے لیے ایسے اقدامات کئے جائیں جن کی بدولت وہ دیہی ترقی کے فائدوں میں شریک ہو سکے۔ نیز ضرورت مند خواتین کو قانونی مشورے اور امداد آسانی سے کم خرچ پر میسر ہونی چاہیئے۔ اور خواتین ملکی عدالتوں میں زیادہ سے زیادہ تعنیات ہوں"[۳۲]

۱۹۶۱ء میں فیملی آرڈیننس پاس ہوا۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو کشور ناہید نے اپنی کتاب "عورت، خواب اور خاک کے درمیان" میں ۱۹۶۱ء میں فیملی آرڈنینس پر سیر حاصل گفتگو کی ہیں۔ جس کی رو سے زرعی زمین میں خواتین کا برابر کا حصّہ قائم کیا گیا۔ دوسری شادی کے لیے مردوں کو پہلی بیوی سے اجازت کا پابند کر دیا گیا۔ عائلی زندگی کے مسائل، میاں بیوی کے درمیان ناچاکی کی صورت حال کی وجہ سے عدالت

سے رجوع کی تجویز دی گئی۔ عائلی زندگی کے مسائل کے لیے فیملی کورٹ کا قیام عمل میں لایا گیا۔

پاکستانی معاشرے میں خواتین کے کردار کو عملی طور پر دیکھا جائے تو خواتین نے پاکستان کی ترقی میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ پاکستانی عورت جہاں خاندانی نظام کو بہتر طور پر نبھا رہی ہے وہیں اپنی نسل کی تربیت اور بہتر نگداشت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ معیشت کی بہتری میں پاکستانی خواتین نے بھی نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ پاکستان میں خواتین نہ صرف تعلیم یا طب کے شعبے میں بینکوں، سرکاری اور نیم سرکاری الغرض زندگی کے ہر شعبے کے اندر اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں عورت کے مقام اور حیثیت کے حوالے سے دیکھا جائے تو عملی زندگی کے اندر خواتین کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دوسرے معاشروں کی نسبت پاکستانی معاشرے میں عورت اپنی مرضی کی زندگی بسر کر سکتی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل عورت کی صورتحال قدرے مختلف تھی۔ پاکستان کے مختلف علاقوں میں اور اس کے رہنے والوں کے درمیان تاریخی اعتبار سے اشتراک پایا جاتا ہے جو فکری ہم آہنگی کو نمایاں کرتا ہے۔ ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری لکھتے ہیں:

> "پاکستان ایک وحدت، ایک اکائی ہے جس میں رنگا رنگ پھول کھل کر پاکستانی معاشرے میں رنگ و بو کا ایک نیا سماں پیدا کر رہے ہیں۔ پاکستان کے مختلف علاقوں اور اس کے رہنے والوں میں نہ صرف تاریخی و تہذیبی اعتبار سے گہرا اشتراک موجود ہے بلکہ عقیدہ و فکر کی ہم آہنگی نے مشترک قدروں کو مزید نمایاں کیا ہے"(۳۳)

عورت ہر دور، معاشرے اور تہذیب میں مردوں کی جانب سے استحصال کا شکار رہی ہے۔ کبھی عورت کو دیوی اور کبھی پاؤں کی جوتی کا درجہ دیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد جہاں خواتین کو بہت سے حقوق سے نوازا گیا، وہیں بہت سے مسائل نے سر اٹھایا۔ فرقہ ورانہ فسادات، بدامنی، خود غرضی اور فرسودہ رسم و رواج کی وجہ سے خواتین کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستانی معاشرے کے اندر بھی لڑکیوں کا گھروں سے باہر نکلنا مشکوک اور معیوب سمجھا جاتا ہے۔ آزادانہ طور پر گھروں سے نکل کر باہر سانس لینا بہت مشکل ہے کیونکہ پاکستانی معاشرے کے اندر بھی عورتوں کو مردوں کی گھورتی نظروں سے لیکر عصمت دری اور آبروں ریزی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں لڑکی کو باہر نکالنے سے گھر والے بھی ڈرتے ہیں کہ لڑکی کی ذات سے وابستہ

اس کی عزت اور آبرو کہیں خطرے میں نہ پڑ جائے۔ آج بھی عورتوں کے حوالے معاشرے کے اندر روایتی تصور موجود ہے جو عورت کو گھر کی دیکھ بھال اور ذمہ داریوں تک محدود رکھتی ہے۔ شاہدہ حسن لکھتی ہیں:

> "تعلیم اور معاشی آزادی کی طرف پیش رفت کے باوجود ہمارا پاکستانی معاشرہ آج بھی قدیم روایات، علاقائی رسم و رواج، مذہبی عقائد اور اقدار کی کھنچی ہوئی سرحدوں کے اندر محبوس ہے اور سیاسی اور سماجی سطح پر بھی جبر و گھٹن کی فضا موجود ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں ہر چند کے عورت کو "بول کے لب آزاد ہیں تیرے" کا خوب صورت مژدہ سنایا جا چکا ہے۔ مگر بولنے اور اپنی ذات کا اظہار کرنے والی عورت کے سلسلے میں فرسودہ ذہنی رویوں اور ردِ عمل کا احوال رہی ہے جو پہلے تھا۔"(۳۴)

پاکستان ایک زرعی ملک ہے۔ معیشت کا انحصار زراعت پر ہے۔ آبادی کا بیشتر حصّہ پاکستان میں دیہات پر مشتمل ہے، جہاں خواتین مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں ۔ لیکن برابر محنت کے باوجود یہ کروڑوں دیہی خواتین اپنے حقوق کے حصول میں مردوں سے بہت پیچھے ہیں۔ زرعی زندگی کے اندر نسائی مسائل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دیہاتوں کے اندر خواتین کو زیادہ امور سر انجام دینے پڑتے ہے۔ جانوروں کی طرح عورتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک عورت اپنی ہمت اور طاقت سے زیادہ کام کرتی ہے۔ تھکاوٹ محسوس کیے بغیر دیہی عورت گھریلو کام کاج، بچوں کی پرورش، بزرگوں کی دیکھ بھال کے علاوہ فی ہفتہ چوبیس گھنٹے زرعی کام کاج بھی کرتی ہے۔ اس کے ساتھ بچوں کی پیدائش کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ صبح سویرے اٹھ کر گھر کے تمام کام سر انجام دیتی ہے۔ مویشیوں کا باڑہ صاف کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے تمام کام بھی کرتی ہے۔ دن میں دو مرتبہ گھاس کاٹنے بھی جاتی ہے اور دن میں دو مرتبہ مویشیوں کو پانی پلانا بھی عورت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ سارا دن گھریلو کام کاج اور زرعی امور میں مصروف رہتی ہے۔ ڈاکٹر نورین رزاق لکھتی ہیں:

> "روایتی معاشرے کی عورت معاشرتی رسم و رواج اور توہمات کے سامنے بے بس تھی۔ مردانہ استحصال اور جاہلیت نے سماجی سطح پر اُسے پست درجے کا شہری بنا دیا تھا

اس کی مصیبت زدہ زندگی میں روشنی کا کوئی وزن نہ تھا۔ کم سن لڑکیاں بیوگی کا بوجھ
اٹھائے معاشرے کے رحم و کرم پر تھیں۔"(۳۵)

عورتوں کو گھروں کے ساتھ کھیتوں کے امور انجام دینے پڑتے ہیں۔ عورتیں کھیتوں میں کام کرتی ہیں، فصل کاٹتی ہیں، دودھ دوہنے اور دور دراز جگہ سے جا کر پانی بھرنے جیسے اہم امور بھی سر انجام دیتی ہیں۔ بغیر کسی اجرت کے عورتیں اکیلے تمام امور سر انجام دیتی ہیں۔ تمام کام کرنے کے باوجود بھی دیہی عورت اپنی مرضی سے سانس لینے کا بھی اختیار نہیں رکھتی ہے۔ آج بھی روایتی سماج کے اندر خواتین مختلف مسائل میں گھیری ہوئی ہیں۔ دیہی علاقوں کی محنت کش خواتین کو مردوں کے برابر حقوق دینے اور محنت کش خواتین کو ان کے جملہ طبی، تعلیمی اور قانونی حقوق دینے کی اشد ضرورت ہے۔

راویتی معاشرے سے مراد وہ معاشرہ ہے جو قدیم روایات کا امین ہوتا ہے۔ وہ ان روایات میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرنا چاہتا ہے۔ یہ اپنے بزرگوں کے رسم ورواج کی پابندی میں فخر محسوس کرتا ہے۔ پرانے رسم ورواج کی حفاظت کرنا یہ معاشرہ اپنا فرض اولین سمجھتا ہے۔ روایتی معاشرے کے اندر عورت کی حیثیت ایک جانور سے کم نہیں ہوتی ہے۔ روایتی معاشرے کی پاسداری دیہی معاشرہ کرتا ہے۔

دیہی معاشرے میں لوگ اپنے کھیتوں میں گھر بنا کر رہتے ہیں۔ روایتی معاشرے میں چونکہ صدیوں سے پرانے طرز زندگی کو اختیار کیا جاتا ہے اس لیے وہاں جدید آلات کا استعمال بہت کم کیا جاتا ہے۔ عورت ذات اپنی مقدور بھر کوشش کے باوجود بھی مردوں کی طرف سے مار پیٹ اور امتیازی سلوک کا بھی سامنا کرتی ہے۔ پاکستان بن جانے کے باوجود بھی خواتین کو پابندیوں اور مشکلات کا سامنا رہا ہے۔ پردے کی رکاوٹ، کم سنی کی شادی، تعلیم و تربیت اور دیگر مسائل کا سامنا دیہی خواتین کو ابھی تک درپیش ہے۔

پاکستان کے دیہی علاقوں میں رہنے والی خواتین کو تعلیم، صحت اور پینے کے صاف پانی سمیت دیگر بنیادی سہولتوں کی کمی کا سامنا بھی رہتا ہے۔ پاکستان کی دیہی خواتین کو عام طور پر فرسودہ رسم ورواج اور جاہلانہ روایات کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عورتوں پر تشدد، ونی، کم عمری کی شادیاں اور جائیداد کے تقسیم ہو جانے کے ڈر سے شادی نہ ہونے دینا جیسے واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دیہاتوں کے اندر آج بھی روایتی تصور موجود ہے۔ لڑکیوں کی نسبت لڑکوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے کیونکہ دیہاتوں کے اندر لڑکیوں کی نسبت لڑکوں کو نسل بڑھانے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان کے دیہی معاشرے کے اندر بہت کم ایسے گھرانے ہوں گے جو لڑکیوں کی تعلیم کو اہمیت دیتے ہے۔ اسی وجہ سے لڑکوں اور لڑکیوں کو الگ الگ دائروں میں رکھا جاتا ہے۔ پاکستان کے اکثر دیہاتوں میں بچوں کے سکول تو مل جاتے ہیں لیکن بچیوں کے سکول بہت کم ملتے ہیں۔ کالج نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ معیاری درس گاہوں کی کمی یا دور ہونے کی وجہ سے ماں باپ بچیوں کو دور بھیجنے کی بجائے اعلیٰ تعلیم نہ دلانے کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ مولانا سید جلال الدین عمری لکھتے ہیں:

> "موجودہ معاشرے میں عورت کی حالت بڑی ابتر رہی ہے۔ وہ ان حقوق سے بڑی حد محروم تھی اور ہے جو اسلام نے اسے عطا کیے ہیں۔ دورِ جاہلیت کی طرح لڑکی کو ایک بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش پر خوشی محسوس نہیں کی جاتی بلکہ ماں باپ اور گھر کے لوگوں پر ایک طرح کی افسردگی چھا جاتی ہے جو لڑکیوں کے سلسلہ میں دیکھی جاتی ہے۔ اس کی تعلیم صحیح معنی میں نہ قدیم ہوتی ہے اور نہ جدید۔ اس کی معلومات کی دنیا خاندان کے طور طریقوں اور رسوم ورواج تک محدود ہوتی ہے۔"(۳۶)

پاکستان کے دیہی معاشرے میں مردوں اور عورتوں کا دائرہ کاموں کے حوالے سے بھی الگ رکھا جاتا ہے۔ سماجی رویوں کے دوہرے معیارات کی صورتحال واضح طور پر پائی جاتی ہے۔ دیہی معاشرے میں مرد گھر کا سربراہ ہوتا ہے۔ عورت کی حیثیت محکوم رعایا کی طرح ہوتی ہے جو حاکم کی پسند اور ناپسند میں ڈھل کر زندگی گزار رہی ہوتی ہے۔ دیہاتوں میں عورت کی بحیثیت انسان کوئی امتیازی شناخت ممکن نہیں ہے۔ اپنی پہچان مرد سے وابستہ رشتے کی وجہ سے کرواتی ہیں۔ دیہی معاشرے کے اندر ایک اچھی عورت وہی ہوتی ہے جو سعادت مند بیٹی، باوفا بیوی، ماں، فرمابردار بہن خاموش بہو جو ہر بات چپ چاپ سن لے اور معاشرے کے بنائے گئے اصولوں سے انحراف نہ کریں۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"عورت کو رشتوں کے نام پر جو غیر مرئی زنجیریں پہنائی جاتی ہیں۔ وہ اتنی قدیم ہیں کہ اب ہمارے اجتماعی شعور میں جاگزیں ہو چکی ہیں۔ لہذا ہم عورت کا بحیثیت فرد تصور ہی نہیں کر سکتے۔ وہ بیٹی ہے، وہ بہن ہے، وہ بیوی ہے، وہ ماں ہے، وہ دادی ہے، وہ نانی ہے، ہر رشتے کے ساتھ کردار کا مخصوص سانچہ اور عمل کا بے لچک عمل ہے۔ بیٹی کے لیے تابعداری ضروری ہے۔ اچھی بیٹی حکم عدولی نہیں کرتی۔ بہن ہے تو گھر میں بھائیوں کے لیے دوسرے بلکہ تیسرے درجے کی شہری ثابت ہو۔ بیوی ہے تو بیک وقت باندی (ساس کے لیے)، خانہ زاد (خاوند کے لیے)، دلدار (دیور کے لیے) باورچن اور دھوبن (گھر کے لیے) بننے کی توقع رکھی جاتی ہے۔ اولاد نہ ہوئی تو شادی کی نیا ڈانوڈال، اولاد ہو گئی تو ممتا کے تمام تقاضوں کا بوجھ جو اعصاب پر"[۳۷]

دیہاتوں کے اندر عورت کے تمام امور پر اختیار مردوں کا ہے۔ مرد کی بالادستی میں عورت اپنی زندگی گزار دیتی ہے۔ پاکستان کے دیہاتی معاشرے کی عورت کی زندگی صرف گھریلو کام کاج تک محدود رہتی ہے۔ چائے سسرال میں ہو یا میکہ میں صرف مرد کے تابع رہ کر تمام امور انجام دیتی ہے دیہاتوں کے اندر عورت، سسرال، میکہ دونوں جگہ کھانا پکانے، گھر کی تمام ذمہ داریوں اور دیگر امور کے حوالے سے پابند ہوتی ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور کے باجود بھی پاکستان کے دیہی معاشرے کے اندر عورت تعلیم سے دور ہے۔ آس پاس دیہی معاشروں کا جائزہ لیا جائے تو بہت کم دیہی معاشرے ملتے ہیں جہاں لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں مہیا ہو پاتی ہیں۔

طبقہ اعلیٰ میں عورتوں کو تو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع مل جاتے ہیں اور آسانی سے تعلیم حاصل کر سکتی ہیں جبکہ ہمارے معاشرے کا یہ طبقہ بہت چھوٹے حصّوں پر مشتمل ہوتا ہے جہاں معاشی پریشانیوں کے سبب لڑکوں کا بھی تعلیم حاصل کرنا بھی مشکل ہوتا ہے اور لڑکیوں کی تعلیم کا سوچنا بھی بہت دور کی بات ہوتی ہے۔ دیہاتوں کے اندر عورتوں کی پیدائش کا مقصد ہی گھریلو امور کی انجام دہی سمجھا جاتا ہے۔ بعض دیہاتوں کے اندر آج بھی عورت کی شادی قرآن سے کر دی جاتی ہے۔ بعض دیہاتوں کے اندر عورتیں خریدی اور بیچی

جاتی ہیں۔ جہیز نہ لانے کے جرم میں ذہنی اور جسمانی تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مردوں کی بالادستی والے سماج کی بہت سی خصوصیات دوسرے ایشیائی ممالک کی طرح پاکستان کے دیہی معاشرے میں بھی پائی جاتی ہیں جہیز کا رواج، خانگی تشدد، عصمت دری اور جنسی استحصال جیسی برائیاں پاکستان کے دیہی معاشرے میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ دیہی معاشروں میں سماجی جبر کے ساتھ ساتھ آمریت اور سیاسی جبر نے دیہی عورتوں کی حالت اور بھی زیادہ نازک کر دی ہے۔ڈاکٹر سیما صغیر لکھتی ہیں:

"عورت کے پسماندہ ہونے میں دیگر اسباب کے علاوہ مرد اساس معاشرہ سب سے زیادہ ذمہ دار ہے۔ طبقہ نسواں کو صرف چراغ خانہ بنا کر مرد اساس معاشرے نے نہ صرف ذہنی و جسمانی استحصال کیا ہے بلکہ دنیا کی ترقی کے راستے بھی مسدود کیے ہیں جس کے باعث آفاقی ترقی کی رفتار میں سستی واقع ہوئی ہے۔"(۳۸)

پاکستان کے دیہی معاشرے کے اندر عورت شہروں کی نسبت زیادہ مظلومیت کا شکار ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شہروں میں بسنے والی خواتین کی نسبت دیہاتی خواتین، معاشی، معاشرتی، قانونی، اور دیگر تمام سہولیات سے محروم ہوتی ہیں۔ بعض خواتین کو مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرنے کے باوجود بھی جسمانی تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ صنفی امتیاز کی صورتحال دیہی معاشرے کے اندر اس طرح بھی نظر آتی ہے۔ بعض جگہ تو پہلے مرد حضرات کو کھانا دیا جاتا ہے اگر بچ جائے تو ان کے بعد خواتین نے کھانا ہوتا ہے۔ اتنی محنت کرنے کے باوجود بھی دیہی خواتین کو میڈیکل کی سہولت بھی میسر نہیں ہوتی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ دیہی خواتین کو شعور بھی نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ دیہی خواتین ان پڑھ ہوتی ہیں۔ اپنے حقوق حاصل کرنے میں ناکام ہوتی ہیں۔ دیہی معاشرے کی خواتین فرسودہ رسم و رواج اور جاہلانہ روایات میں جکڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ عورتوں پر تشدد، جائیداد کی تقسیم ہو جانے کے ڈر سے شادی نہ کرنا، کم عمری کی شادی جیسے واقعات کے علاوہ دیہی خواتین سماجی دباؤ کا بھی شکار نظر آتی ہیں۔ اکبر ایس احمد لکھتے ہیں:

"پاکستانی معاشرہ پیچیدہ بھی ہے اور متنوع بھی۔۔۔ پاکستانی معاشرے میں مردانگی اور عزت ہیں۔ نسل مرد سے چلتی ہے۔ شادی کے بعد تو طن جدی ہوتا ہے۔ روایتی

معاشرے میں مرد کی عزت کا اس کی عورت سے گہرا تعلق ہے اور اس کی خدمت
اور اس کے موقف سے وفاداری عورتوں کا مقصد حیات ہے۔"(۳۹)

افسانہ نگار خواتین کے ہاں دیہاتی زندگی کا ماحول اور فضا نام نہاد اقدار، کسان کا استحصال، رسوم و رواج، عورتوں کے ساتھ برا سلوک، جاگیر دارانہ نظام، طاقت اور اقتدار کا نشہ، توہمات پرستی، تعلیم سے دوری، جہالت، دکھ، تکالیف اور دیگر کئی پہلو کی عکاسی ملتی ہے۔ قدیم دیہاتی نظام میں عورت کو خریدنے کا کام کیا جاتا تھا۔ عورت کو جانوروں کی طرح بیچا جاتا تھا۔ غیرت کے نام پر قتل اور رسم و رواج کے ساتھ سختی کے ساتھ عمل کروایا جاتا تھا۔ سید جلال الدین انصر عمری لکھتے ہیں:

"عورت کا کام بچوں کی دیکھ بھال، گھر کا انتظام، کھانے اور کپڑے کی تیاری عورت کے فرائض رہے ہیں اور جانوروں کا شکار، زراعت، تجارت اور دشمن کی مدافعت عورت نے کی ہے کیونکہ مرد جفاکش اور محنتی ہے۔ عورت اور مرد کی قوتوں کا یہ فرق اور صلاحیتوں کا یہ فرق تاریخ کے بیشتر ادوار میں عزت اور ذلت کا معیار بن گیا ۔۔۔ قدیم معاشرے میں عورت کو ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اس کو جانوروں کی طرح خریدا اور بیچا جاتا تھا حتیٰ کہ بعض اوقات اس کو ان حقوق سے بھی محروم رکھا گیا جن سے اس زمین پر سانس لینے والا ہر متنفس بہرہ مند ہے۔"(۴۰)

پاکستان میں بعض دیہی معاشرے میں عورت کی حیثیت منقولہ جائیداد اور شے کی طرح ہوتی ہے۔ حویلی کا کام، مردوں کو رجھانا اور دل لگی کی ذمہ داری کمی کمین عورتوں پر عائد کر دی جاتی تھی۔ دیہی معاشرے کے اندر جذباتی اور جنسی استحصال عام سی بات ہے۔ دیہی معاشرے میں عورت ایک بوجھ کی طرح ہوتی ہے۔ دیہاتوں میں بیٹوں کے ذریعے نسل بڑھانے کی خواہش بزرگ خواتین کو بے چین رکھتی ہے۔ کم عمر لڑکیوں کی شادی بڑی عمر کے مردوں کے ساتھ کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ دیہاتوں کے حوالے سے خالدہ حسین نے اپنے افسانوں میں ان مظلوم لڑکیوں کی عکاسی کی ہے جن کی شادی زیادہ عمر مردوں سے کر دی جاتی ہے۔ خالدہ حسین نے دیہاتوں کے مختلف النوع مسائل اور حالات کو اپنے افسانوی مجموعوں کے اندر بڑی

خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانوی مجموعوں کے اندر دیہاتوں میں عورت کی سماجی معاشی، سیاسی اور تمدنی صورت حال کی عکاسی کی ہے۔

پاکستان میں شہری اور دیہی تفریق بہت بڑھ چکی ہے۔ ویسے تو بڑے شہروں میں عورتوں کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن دیہاتوں کے اندر نسائیت کو بہت سے مسائل درپیش ہے۔ غربت نسائی چہرہ رکھتی ہے۔ دیہی علاقوں کی پسماندگی کا سب سے زیادہ اثر عورتوں پر ہوتا ہے جس کی وجہ سے عورتیں تشدد کا نشانہ بنتی ہیں۔ اقتصادی وسائل سے محرومی بہت سی برائیوں کو جنم دینے کا باعث بنتی ہے۔ غربت کی وجہ سے لوگ اپنی بنیادی ضروریات پورا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ یوں معاشرے میں فرسٹریشن پھیلتی ہے۔ عورت چونکہ معاشرے کا سب سے کمزور فرد ہوتا ہے اس لیے یہ فرسٹریشن ان پر ہی نکالی جاتی ہے۔

پاکستانی معاشرہ دو بڑے حصّوں میں منقسم ہے ۔ آبادی کا ایک حصّہ دیہی معاشرے پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصّہ جدید معاشرے پر مشتمل ہے۔ لفظ جدید قدیم کا متضاد ہے۔ اس سے مراد وہ معاشرہ جو قدیم قدروں کا حامل نہیں بلکہ معاشرت کے جدید تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ دیہاتوں کی نسبت جدید معاشرے میں زندگی کی بنیادی سہولتیں تعلیم، صحت، جان، مال، روزگار و تفریح وغیرہ آسانی کے ساتھ تمام افراد کو حاصل ہوتی ہیں۔ جدید معاشرہ ہر نئی اصلاح و پالیسی کو فوراً قبول کرتا ہے اور نئی اقدار و روایات کو پرانی اقدار پر ترجیح دیتا ہے۔ اور انہیں چھوڑنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

جدید معاشرے کی زیادہ تر خواتین زیادہ تعلیم یافتہ اور باشعور ہوتی ہیں۔ عورتیں مردوں کے پہلو بہ پہلو کام کرتی ہیں۔ یہ عورتیں پسماندہ اور قدامت پسند معاشرے سے نسبتاً آزاد ہوتی ہیں۔ فارغ وقت میں خواتین شاپنگ کرتی ہیں۔ انھیں من پسند کپڑے، جوتے اور جیولری کی خرید میں ایک خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔ ان کی تفریح یہی ہوتی ہے کہ نئی سے نئی چیز خریدی جائے تاکہ انفرادیت قائم رہے۔ شہری خواتین کو اپنے حقوق کے حوالے سے بہت شعور ہے۔ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی مذہبی آزادی، ووٹ دینے کا حق آزادی اظہار اور دیگر تمام حقوق حاصل ہیں۔ بے روزگاری اور مہنگائی کے دور میں میاں اور بیوی دونوں مل

کر گھر کا خرچہ چلانے کی تگ و دو میں ہیں۔

طبقاتی معاشرے کے اندر مرد اور عورت دونوں کو مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن عورت ان مسائل میں زیادہ گھیری ہوئی ہے۔ شہروں میں خواتین کا تعلیم حاصل کرنے کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ ہر لڑکی جو تعلیم حاصل کر رہی ہوتی ہے اس کا یہی خواب ہوتا ہے کہ وہ اپنی قابلیت کے مطابق شعبے میں اپنا نام بنائے لڑکیوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ گھر والوں کو راضی کرنا ہوتا ہے اور کچھ والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ بیٹیوں کی جلد شادی کر دی جائے اور نوکری شادی کے بعد کر لیے۔ اکثر اوقات شادی کے بعد سسرال والے لڑکیوں کو ملازمت کی اجازت ہی نہیں دیتے۔

شادی شدہ خواتین کو یہ بھی مسئلہ ہوتا ہے کہ اگر یہ ملازمت کرے گی تو گھر کون سنبھالے گا؟ یہی وجہ ہوتی ہے کہ ایسی خواتین شدید تھکاوٹ کے باوجود سب کو وقت دینے اور خوش کرنے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔ انھیں سب کو بتانا پڑتا ہے کہ دفتر کے ساتھ وہ گھر، بچے، فیملی اور تمام معاملات خوش اسلوبی سے انجام دے سکتی ہے۔ ایسے معاملات میں شہری عورت اپنی ذات کے لیے بھی وقت نہیں نکال سکتی ہے لیکن اس سب کے باوجود بھی شہری خواتین بہت سے مسائل میں جکڑی ہوئی ہیں کیونکہ شہری خواتین پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ گھر گرہستی کے ساتھ ساتھ ملازمت کر کے گھر کے اخراجات پورا کرنے، بچوں کی پیدائش و پرورش کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بادشاہ منیر بخاری لکھتے ہیں:

> "جب وہ ترقی کی اگلی منزل کی طرف گامزن ہے تو اس کے بدلتے معاشرے اور بدلتے رول میں دوسری نوعیت کے مسائل درپیش ہیں مثلاً مردوں کے ساتھ کام کے مسائل، آزاد تعلیم یافتہ خود مختار عورت کے گھریلو عورت کے مسائل، صدیوں سے عورت کی کمتر حیثیت کے تصور کی وجہ سے مرد اور عورت کا ٹکراؤ، اس سلسلے میں مردوں کی نفسیاتی گھتیاں، جذباتی طور مردوں کا ان کو بلیک میل کرنا، آزادی کے نام پر ان کا مختلف سطحوں پر استحصال۔"(۴۱)

شہروں کے اندر چونکہ تمام ضروریات زندگی پیسوں سے خریدی جاتی ہے۔ دن بدن مہنگائی کی وجہ

سے شہری خواتین اپنے گھریلو امور کے ساتھ ساتھ ملازمت کے شعبے سے بھی وابستہ ہوتی ہیں۔ ملازمت پیشہ خواتین کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مردوں کے مردانہ رویوں کو سہتے ہوئے اپنا مقام بنانے اور صلاحیتوں کو منوانے کے لیے زیادہ محنت کرتی ہیں۔ دفتروں میں کام کرنے والے مرد حضرات جو خواتین پر طرح طرح کے جملے کستے ہے جو مردوں کی منفی سوچ کی عکاسی کرتے ہے۔ ایسے جملے اور تبصرے عورتوں کے لیے نہ صرف تکلیف کا باعث بنتے ہیں بلکہ کام پر بھی منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ کام کرنے کی جگہ پر جنسی طور پر ہراساں کرنے کی بھی کوشش کی جاتی ہے۔

ملازمت پیشہ خواتین کا ایک اہم مسئلہ ٹرانسپورٹ کا بھی ہے ۔ بہت کم دفتروں میں خواتین کو ٹرانسپوٹ کی سہولیات میسر ہوتی ہے۔ مگر بہت سے دفتروں میں عورتوں کو یہ سہولت میسر نہیں ہوتی ہے۔ خواتین بھی مردوں کی طرح بسوں کے دھکے کھاتی ہیں لیکن بسوں کے اندر بہت کم سیٹ عورتوں کی ہوتی ہیں اور اکثر ان پر بھی مردوں کا قبضہ ہوتا ہے ۔ مردوں کا عورتوں کے حصّوں سے چڑھنا اور اترنا، پیچھے بیٹھ کر چھونے کی کوشش کرنا، ڈرائیوروں کا عورتوں کو دیکھ کے گھٹیا گانا لگانا اور کنڈیکٹروں کا عورتوں کو ہراساں کرنے کی کوشش وغیرہ جیسے مسائل ملازمت پیشہ خواتین کے لیے انتہائی تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ چند ایسے مسائل ہیں جو ملازمت پیشہ خواتین کو عموماً پیش آتے ہیں جس کی وجہ سے خواتین جسمانی اور ذہنی اذیت کا شکار ہوتی ہیں اور بدلے میں مردوں کی نسبت بہت کم اُجرت دی جاتی ہے۔ گھروں سے باہر ملازمت کی غرض سے جانے والی خواتین کو مردانہ رویوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔

پاکستانی معاشرے میں خواہ دیہاتی معاشرہ ہو یا شہری معاشرہ مردانہ حاکمیت ہوتی ہے۔ عورت کو قدم قدم پر آج کے ترقی یافتہ دور کے باوجود بھی مسائل کا سامنا ہے۔ شہروں کے اندر معاشی بوجھ کو کم کرنے کے لیے مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرتی ہے۔ مگر ان سب کے باوجود بعض جگہ عورتوں کو ستائشی کلمات سے نہیں نوازا جاتا ہے بلکہ اسے اس کی کمائی کا طعنہ دے کر دبا کر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بچوں کی پرورش، گھر گرہستی اور ملازمت کے دوران پیش آنے مسائل کے علاوہ بھی کئی طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دیہی معاشرے کے اندر تو لڑکیوں کی جلدی شادی کروانے کا رواج ہوتا ہے۔ لیکن شہروں کے اندر والدین اپنی بچیوں کو پہلے تعلیم حاصل کرواتے ہیں۔ والدین کا مقصد بچوں کی جلد شادی کرنے کے بجائے ان کو کسی عہدے پر فائز کرنا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے شہروں کے اندر والدین اپنے بچوں کو ہر طرح کی سہولیات فراہم کرتے ہیں تاکہ ان کے بچے کسی عہدے پر فائز ہو سکیں۔ پڑھائی کے دوران اپنی بچیوں کے رشتے اس وجہ سے طے نہیں کرتے کہ ان کا رجحان پڑھائی سے ہٹ نہ جائے اور بعض اوقات اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ مناسب رشتہ عمر کی زیادتی کی وجہ سے مل نہیں پاتا جس کی وجہ سے لڑکیوں کی شادی مقررہ وقت پر نہیں کر پاتے اور اکثر عمر بھی زیادہ ہو جاتی ہیں۔ تو ایسی لڑکیوں کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کی حیثیت استعمال کرنے والی شے کی طرح ہو جاتی ہے۔ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد شہروں کے اندر بعض لڑکیوں کو نمائشی طور پر رشتہ لانے والوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور بعض اوقات عمر کی زیادتی کے باعث رشتے والے رد کر کے چلے جاتے ہے جس کی وجہ سے شہری خواتین کو نفسیاتی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

شہروں کے اندر بھی جہیز کی لمبی فہرست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ترقی یافتہ دور کے باجود آج بھی شہری معاشرہ مادہ پرست ہے۔ شہروں کے اندر مہنگائی زیادہ ہوتی ہے۔ معاشی بوجھ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر کسی لڑکی کا رشتہ ہو بھی جائے تو گاڑی سمیت دیگر چیزوں کی فرمائش کر دی جاتی ہے۔ اگر لڑکی کے گھر والے فرمائش پر پورا نہ اتریں تو اس رشتے کو ہی توڑ دیا جاتا ہے۔ جدید معاشرے کا فرد داخلی اور خارجی مسائل میں مبتلا رہتا ہے۔ والدین اپنی بچیوں کی تعلیم اور ان کی بنیادی ضروریات پر پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ شہروں کے اندر ہر چیز ہی بہت مہنگی ملتی ہے۔ جہیز کی لمبی فہرست کو پورا کرنے میں اکثر والدین ناکام رہتے ہے جس کی وجہ بیٹیوں کا رشتہ نہ چاہتے ہوئے بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے لڑکیوں میں نفسیاتی مسائل میں اضافہ ہو رہا ہے۔

جدید معاشرے کے حوالے سے دیکھا جائے تو ایک اہم مسئلہ طلاق کا بھی ہے۔ دیہاتوں کی نسبت عائلی زندگی کے مسائل کا سامنا شہری خواتین کو بہت زیادہ ہے۔ معمولی سی بات پر مردوں کا طلاق دے دینا شہروں میں ایک عام سی بات ہے۔ شادی بیاہ کو جدید معاشرے کے اندر اتنی اہمیت نہیں دی جاتی ہے اور نہ

شادی بیاہ کے معاملات میں سمجھوتہ کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے مرد اور عورت میں ناچاکی رہتی ہے۔ اکثر حالات اتنے کشیدہ ہو جاتے ہیں کہ علیحدگی کی نوبت آجاتی ہے۔ طلاق کی صورت میں صرف خواتین پر ہی انگلی اٹھائی جاتی ہے۔ عورت بے قصور ہونے کے باوجود بھی قصور وار ٹھہرائی جاتی ہے۔ مرد بے قصور گردانا جاتا ہے۔ معاشرہ یہی سمجھتا ہے کہ عورت میں خامی ہو گئی تو طلاق کی نوبت آئی ہے۔ لفظ عورت سے جوڑا معاشرتی بیانیہ فرماں بردار بیٹی، عزت کے لفظ سے پیوست بہن، محکوم بیٹی، بچوں کی جنت ماں اور اگر عورت ان پہلو سے بغاوت کریں معاشرے کے اندے قصوروار سمجھی جاتی ہے۔

جدید زندگی میں معاش کا مسئلہ بھی عورتوں کو درپیش ہے۔ بنیادی ضروریات زندگی پورا کرنے کی خاطر عورتوں کو گھر سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ شہروں کے حوالے سے خالدہ حسین نے عموماً اس عورت کو موضوع بنایا ہے جن کی طاقتور ہاتھوں میں ان عورتوں کی عزت محفوظ نہیں۔ خالدہ حسین نے طاقت ور طبقوں کو مختلف طریقوں سے بے نقاب کیا ہے کہ طاقت ور طبقے ملازمت کرتے ہوئے لڑکیوں کا شکار کرتے ہیں ملازمت کے دوران لڑکیوں کو بھی دفتری امور میں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زیادہ کام کروا کے کم اُجرت دی جاتی ہے۔

پاکستان کے جدید معاشرے میں عورت کے مسائل پر بحث کی جائے تو ایک اہم مسئلہ عورتوں پر ہونے والے جسمانی تشدد بھی ہے۔ شہروں کے اندر بھی مرد عورت کو جانوروں کی طرح مار پیٹ کرتے ہیں۔ بعض شہری مرد پڑھے لکھے اور باشعور ہونے کے باوجود عورت کو پیر کی جوتی سمجھتے ہیں اور عورت پر حکمرانی کرتے ہیں اور جنسی طور پر ہراساں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شہروں کے اندر جنسی بے راہ روی جیسے مسائل بہت بڑھ چکے ہیں۔ مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلق ایک فطری اور قدرتی طور پر موجود ہے۔ لیکن شہروں کے اندر مرد عورتوں کو ان کی مرضی کے بغیر جنسیت کا شکار بناتا ہے۔ جنس مردوں کی جبلی اور بنیادی ضروریات ہے لیکن شہروں کے اندر فحاشی پھیلانے، جنسی و جذباتی ہیجان پیدا کرنے اور جنس برائے جنس کے مسائل کی زد میں شہری خواتین نہیں بچ سکیں۔ شہروں کے اندر عورت پر تشدد، مار پیٹ، جنسی

ہر اساں کرنے، نفسیاتی طور پر دباؤ سہنے جیسے مسائل کا سامنا آج بھی بعض جگہ موجود ہے۔

جدید معاشرے میں عورت مختلف شعبوں میں اپنا لوہا منوا رہی ہے۔ مگر چند مخصوص شعبوں کے علاوہ ملازمت کو خواتین کے لیے غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جدید دور میں بھی لوگ عورت سے گھروں کے کام اور کھیتوں میں کام کرواتے ہیں۔ شہروں میں خواتین کھیتوں میں کام کے بجائے دفتروں میں امور انجام دیتی ہیں۔ مگر پڑھی لکھی خواتین کا دفتروں میں مردوں کے برابر کام کرنے کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ آج بھی شہری معاشرے کے اندر عورت کے حوالے سے سوچ کا مسئلہ در پیش ہے۔ پاکستان کے معاشرے کے اندر عورت کی حالت بہت ہی پیچیدہ ہے۔ دیکھا جائے تو ایک طرف اس ملک کے اندر فاطمہ جناح جنہوں نے صدارتی انتخاب میں ۱۹۶۲ء میں حصّہ لیا۔ بعد میں دوبارہ وزیر اعظم عورت کو ہی منتخب کیا گیا۔

لیکن دوسری طرف دیکھا جائے تو شہروں کے اندر عورتوں کی حالت اس قدر بدتر ہے کہ اس ملک کے اندر عورتوں پر ہونے والے جرائم کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ شہری معاشرے کے اندر خواتین کو در پیش مسائل کے حوالے سے دیکھا جائے تو پروفیشن کو چننے میں پابندی، انصاف تک رسائی میں رکاوٹ، کھیلوں میں شمولیت میں رکاوٹ، گھر اور گھر سے باہر عدم تحفظ، عزت کے نام پر قتل جیسے مسائل کا سامنا اکیسویں صدی عیسوی میں بھی خواتین کو در پیش ہیں۔

ہ) خالدہ حسین سوانحی و ادبی آثار

خالدہ حسین کا تعارف:

خالدہ حسین کا اصل نام خالدہ اصغر ہے۔ خالدہ اقبال کے قلمی نام سے جانی جاتی ہیں۔ ۱۸ جولائی ۱۹۳۸ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ ان کے مختلف نام ان کی پہچان رہے۔ خالدہ حسین کا نام ایک شخصیت کے نام پر رکھا گیا۔

بی بی امینہ لکھتی ہیں:

"خالدہ حسین جو خالدہ اصغر اور خالدہ اقبال کے قلمی ناموں سے جانی جاتی ہیں ۔۔۔خالدہ حسین جب پیدا ہوئیں۔اس سے کچھ عرصہ پہلے ترکی کی خالدہ ادیب خانم نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔چونکہ ان کے نام کا بڑا چرچا تھا اس لیے ان کا نام بھی وہی رکھ دیا گیا"(۴۲)

خالدہ حسین کا اصل نام خالدہ اصغر ہے اور ان کے شوہر کا نام اقبال حسین تھا۔اپنے شوہر کے نام کی وجہ سے اپنا نام بھی خالدہ حسین رکھ دیا اور اسی نام کی وجہ سے پہچانی جانے لگیں۔خالدہ حسین لاہور میں پیدا ہوئیں۔خالدہ حسین، شیخ قانون گو خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ان کے والد کا نام ڈاکٹر عبد الغنی اصغر تھا۔ان کی والدہ کا نام ہاجرہ بی بی تھا۔خالدہ حسین کا شجرہ نسب اکبرِ اعظم کے ایک رتن راجا ٹوڈر سے جا ملتا ہے۔ان کے آباؤاجداد کا تعلق فیصل آباد سے تھا۔خالدہ حسین کے تین بھائی اور ایک بہن تھیں۔بہن کا نام محمودہ اصغر اور تین بھائی افتخار اصغر، اقتدار اصغر اور امتیاز اصغر ہیں۔بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہیں۔

خالدہ حسین نے اپنی ابتدائی تعلیم ایک ہندو اسکول "سوہن لال ہائی سکول" سے حاصل کی۔پانچویں تک انھوں نے یہیں سے پڑھا اور پھر لیڈی میکلیکسن لاہور میں داخلہ لے لیا۔چھٹی جماعت میں تھیں کہ تقسیمِ ہند کا واقعہ رونما ہو گیا۔گھر والے وارث روڈ سے ۳۰ جیل روڈ میں منتقل ہو گئے۔میٹرک تک اسی سکول سے تعلیم حاصل کی۔ایف۔اے اور بی۔اے۔کا امتحان "لاہور کالج برائے خواتین" سے پاس کیا۔ایم۔اے کے لیے پنجاب یونی ورسٹی میں ایم اے سائیکالوجی میں داخلہ لیا۔دو مہینے کے بعد چھوڑ دیا۔اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے اردو کیا۔اپنی تعلیم کے حوالے سے خالدہ حسین اپنے انٹرویو میں کہتی ہیں:

"لاہور ہی میں پرائمری تک ایک ہندو سکول سوہن لال ہائی سکول میں نے پڑھا۔ کے جی سے لے کر کلاس فائیو تک یہ وہی بلڈنگ ہے۔جہاں بعد میں مدرسہ البنات بن گیا۔۔۔تو مجھے اتنی سمجھ نہیں تھی لیکن پھر بھی ہمارے سکول کا جو ماحول تھا اس

میں ہندو مذہب کا کافی داخل تھا۔ ہماری صبح کی prayer جو ہوتی تھی وہ بھی سنسکرت
میں ہوتی تھی۔"(۴۳)

۱۹۹۵ء میں خالدہ حسین کی شادی ڈاکٹر محمد اقبال حسین سے ہوئی جو کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر محمد اقبال حسین انجینئرنگ کے شعبے سے وابستہ تھے۔ شادی کے بعد ڈاکٹر محمد اقبال حسین کا تبادلہ لاہور سے کراچی ہو گیا۔ خالدہ حسین بھی اپنے شوہر کے ساتھ کراچی چلی گئیں۔ خالدہ حسین نے کراچی جانے کے بعد کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات سر انجام دیں۔ بارہ سال کے عرصے کے بعد مصروفیت کے باعث افسانہ نگاری کو خیر باد کہہ دیا تھا۔

خالدہ حسین کا ایک اکلوتا بیٹا اور تین بیٹاں تھیں۔ بڑا بیٹا ڈاکٹر خالدہ حسین ہے جو ڈاکٹر کے شعبے سے وابستہ ہے۔ چھوٹی بیٹی ہما حسین ہے جو سول انجینئر ہے۔ اس سے چھوٹی بیٹی فاطمہ حسین ہے، جو انگلش میڈیم اسکول میں تدریس کے شعبے سے وابستہ تھیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد سب کچھ چھوڑ کر اپنے امور خانہ کی ذمہ داریاں اٹھالی۔

خالدہ حسین نے اپنی عملی زندگی کا آغاز "لاہور کالج برائے خواتین" لاہور سے تدریسی فرائض کے طور پر کیا۔ تین سال تک اس کالج میں لیکچرار کے طور پڑھاتی رہیں لیکن تین سال بعد ملازمت کو ترک کر دیا۔ ۷۰ء یا ۸۰ء میں خالدہ حسین نے "پی اے ایف شاہین کالج" میں دوبارہ ملازمت کا آغاز کیا۔ تدریسی فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ لکھنے میں بھی نکھار پیدا ہوا۔ چونکہ اس کالج میں آپ کو ایک ادبی ماحول میسر ہوا جس کی وجہ سے ادبی مشاغل کا بھی آغاز ہو گیا۔ لیکن اسی دوران ڈاکٹر محمد اقبال حسین کا تبادلہ اسلام آباد میں ہوا۔ جوائینٹ سیکرٹری کی حیثیت سے اقبال حسین اسلام آباد چلے گئے۔ خالدہ حسین بھی ان کے ہمراہ اسلام آباد چلی گئیں۔ اسلام آباد جا کے خالدہ حسین نے "ماڈل کالج برائے طالبات ایف۔ اے۔ سکس / ٹو" میں دوبارہ تدریسی فرائض سر انجام دینا شروع کر دیے۔ ۱۹۹۷ء میں اسی ادارے سے ریٹائر ہوئیں۔

اردو ادب میں خالدہ حسین ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں۔ جدید افسانہ نگاروں میں خالدہ حسین منفرد شخصیت میں شمار ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

"بلاشبہ خالدہ حسین کا نام اردو کے نئے افسانے کے اہم ترین ناموں میں شمار ہوتا ہے اس کے ہاں وجودی نقطہ نظر ملتا ہے وہ خوف، شک اور کراہت کی لغویت میں ذات کے معنی تلاش کرتی ہے۔"(۴۴)

خالدہ حسین نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز میٹرک میں شروع کر دیا تھا۔ گھر کے ادبی ماحول نے خالدہ حسین کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان کی ادبی زندگی کے آغاز کے حوالے سے ڈاکٹر اعجاز راہی لکھتے ہیں:

"ان کی ادبی زندگی کا آغاز اچانک شہرت سے ہوا۔ ان کے "ادب لطیف" میں چھپنے والے افسانے نے ہی انہیں شہرت کے داستانوں تک پہنچا دیا۔"(۴۵)

خالدہ حسین نے اپنی گھر کے ادبی ماحول کی وجہ سے زمانہ طالب علمی میں ہی افسانہ نگاری کا آغاز کر دیا تھا۔ گھر کے ادبی ماحول، پنجاب پبلک لائبریری اور اپنی دوست ریحانہ کی بدولت ادب سے وابستہ ہو گئیں۔ خالدہ حسین کے تخلیقی سفر کے حوالے سے بی بی امینہ لکھتی ہیں:

"خالدہ حسین ابھی نویں جماعت میں تھیں کہ افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ گھر کے ادبی ماحول، پنجاب لائبریری اور اپنی بچپن کی سہیلی ریحانہ ڈار کی بدولت آپ ادبی اور بالخصوص ترقی پسند اور معاصر ادب سے آشنا ہوئیں۔۔۔ جب آپ میٹرک میں آئیں تو آپ نے اپنی پہلی مکمل کہانی سپرد قلم کی۔ جو ایک سہیلی حامدہ کی وساطت سے رسالہ "حرم" تک پہنچی۔"(۴۶)

خالدہ حسین کی کہانیاں "حرم" میں شائع ہوتی تھیں "حرم" میں ابھی دو تین ہی کہانیاں چھپی تھی کہ آپ کو یہ احساس ہو گیا کہ "حرم" کوئی ادبی رسالہ نہیں ہے تو خالدہ حسین نے جلد ہی اس رسالے کو خیر باد کہہ کے مرزا ادیب کے رسالے "ادب لطیف" میں اپنی کہانیاں شائع کروانا شروع کر دی۔ اپنے پہلے افسانے کے حوالے سے خالدہ حسین بی بی امینہ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتی ہیں:

"میرا پہلا افسانہ "نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں" ہے۔ یہ میٹرک میں لکھا گیا تھا۔ لیکن میں اس کو اپنا پہلا افسانہ نہیں مانتی۔ میں اپنے اسلوب اور اسٹائل کے لحاظ سے جسے اپنا پہلا افسانہ مانتی ہوں وہ دل دریا ہے جو ادب لطیف (لاہور) میں ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت میں غالباً بی۔ اے کر رہی تھی۔"[۴۷]

خالدہ حسین کی افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۵ء میں ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ "نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں" مشمولہ "قندیل" میں شائع ہوا۔ شادی کے بعد خالدہ حسین مجلسوں اور محفلوں سے دور رہیں۔ اگرچہ ڈاکٹر محمد اقبال حسین نے آپ کو لکھنے سے نہیں روکا تھا لیکن گھریلو امور کی وجہ سے ادبی محافل سے دوری اختیار کر لی۔ ان کے افسانوں کے پانچ مجموعے ہیں۔ پہلا مجموعہ "پہچان" کے نام سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "دروازہ" ۱۹۸۴ء تیسرا مجموعہ "مصروف عورت" ۱۹۸۹ء" چوتھا مجموعہ "ہیں خواب میں ہنوز ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ اور پانچواں مجموعہ "میں یہاں ہوں" کے نام ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ چھٹا مجموعہ "جینے کی پابندی" ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔ ایک تنقیدی مضمون "مجموعہ خالدہ حسین" ۲۰۰۸ء شائع ہوا اور ایک انتخاب خالدہ حسین (افسانے) ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا۔ اور ناول "کاغذی گھاٹ" ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر زینت افشاں لکھتی ہیں:

"خالدہ حسین کی مطبوعہ کتابوں میں پہچان (افسانے) ۱۹۸۱ء، دروازے (افسانے) مصروف عورت (افسانے) ۱۹۸۹ء، ہیں خواب ہنوز (افسانے) ۱۹۹۵ء، کاغذی گھاٹ (ناول) ۲۰۰۲ء، میں یہاں ہوں (افسانے) ۲۰۰۵ء شامل ہیں۔"[48]

خالدہ حسین کے افسانے ملک کے ادبی جرائد، ماہ نو، ادب لطیف، اوراق، سویرا، نیا دور، دریافت میں مختلف ادوار میں شائع ہوتے رہے۔ خالدہ حسین نے بہت سے تنقیدی مضامین لکھے جو مختلف رسائل اور اخبارات کی زینت بنے۔ اس کے علاوہ غیر ملکی ادب کے تراجم بھی کیے۔ مختلف تراجم اپنے افسانوی مجموعے "مصروف عورت"، ہیں خواب میں ہنوز" اور "میں یہاں ہوں" میں شامل کیے۔ مارکیٹ اسٹریٹ کا اسپینوز (طویل افسانہ) از آئی۔ بی۔ سنگر آئزک بشو سنگر (پولینڈ) امریکہ) مشمولہ مصروف عورت میں شامل کیا۔ جزیرہ

(افسانہ) از سلینہ حسین (بنگلہ دیش) مشمولہ "ہیں خواب میں ہنوز" میں شامل کیا۔ بستی (افسانہ) از محمد تاملا مجموعہ "میں یہاں ہوں" میں شامل ہے۔

"لاٹری" (افسانہ) از شرلی جیکسن (امریکہ) "میں یہاں ہوں' میں شامل ہیں "سنگلاخ مسافت" (خود نوشت) از فدویٰ طوقان اور "جہنم پتری" از بیپسی سدھوا مجموعہ "میں یہاں ہوں' میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ "عورت اور لکھنا"" آخری رسومات" ایک طویل خط (افسانہ) اس کے علاوہ (نظم) دلھن کا شکوہ (نظم) دلھن کا الودعی گیت)۔ "موسم سرما کی ایک رات" (افسانہ) "انکشاف" کا ترجمہ کیے۔ تراجم کے علاوہ خالدہ حسین نے ترتیب و تالیف کی بھی خدمات سرانجام دیں۔ ڈرامہ نگاری میں بھی خالدہ حسین نے اپنا لوہا منوایا۔ "دہان زخم" (افسانہ مشمولہ دروازہ") میں شامل ہے۔ "جبر" (سیریل) اور "آشوب" کے نام سے مختلف ڈرامے لکھے۔ اس کے علاوہ خالدہ حسین نے انگریزی افسانوں کے بھی تراجم کیے۔

۱۹۶۰ء میں پاکستان میں افسانے کا ایک نیا سفر شروع ہوا۔ اس دور میں بہت اہم لکھنے والوں میں جو نام شامل ہیں ان میں ایک اہم نام خالدہ حسین کا بھی ہے۔ خالدہ حسین نے تجریدیت، امیجری اور علامت کے رجحانات کو اس انداز سے سانچے میں ڈالا ہیں کہ ان کا زمین، تہذیبی مزاج اور روایت سے تعلق استوار کر دیا ہے۔ خالدہ حسین علامتوں اور تجریدی اسلوب کا سہارا لے کر اپنے تخلیقی اور حسی تجربوں کو بیان کرتی ہیں۔ تاہم ان کی عبارت میں گہری معنویت نظر آتی ہے۔ انتظار حسین لکھتے ہیں:

> "خالدہ حسین کو اوپر سے علامت کا رنگ چھڑکنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ سوچنے اور چیزوں کو دیکھنے کا انداز ہی کچھ ایسا ہے کہ بیان میں ایک علامتی سطح اُبھر آتی ہے اور کہانی دو سطحی بن جاتی ہے اور شاید اسی لیے انھیں نثر میں شاعری کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اور یہ کتنی بڑی بات ہے اور خاص طور پر اس زمانے میں کہ انھیں نثر لکھنی آتی ہے۔"(۴۹)

خالدہ حسین کے افسانوی مجموعوں میں موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے۔ خالدہ حسین کے افسانوں میں ایک موضوع نسائی مسائل: روایتی اور جدید معاشرہ بھی ہے۔ خالدہ حسین کے افسانوں میں

گھروں، بستیوں، شہروں محلوں کی جتنی تفصیل ہے اتنی کسی اور کے ہاں نہیں ملتی ہے۔ جو خارج ہے وہ داخل ہے خالدہ حسین اپنے افسانوں کے اندر داخل اور خارج کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔

ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ، ڈاکٹر طاہر مسعود، بی بی امینہ اور ڈاکٹر نجیبہ عارف کو مختلف انٹرویوز میں اپنے تخلیقی سفر اور اپنی ذاتی زندگی سے متعلق گفتگو کی ہے۔ جس سے خالدہ حسین کے فن اور شخصیت کی تفہیم اُبھر کے سامنے آتی ہیں۔ خالدہ حسین کی کہانیاں عصری شعور سے کما حقہ لبریز، گہری معنویت اور اسلوب کے امتزاج سے سامنے آتی ہیں۔ عدم تحفظ، عدم شناخت اور صنف نازک کا احساس ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہے۔ ڈاکٹر عصمت جمیل رقمطراز ہیں:

> "خالدہ حسین نے عورت کے عدم تحفظ، لاحاصلی اور بے بسی کو اپنے جدید علامتی اسلوب میں اس طرح ڈھالا ہے کہ ایک پڑھی لکھی عورت کے محسوسات اپنی تمام تر حسیات کے ساتھ سامنے آگئے ہیں۔"(۵۰)

ان کے افسانوں کے اندر گھریلو ماحول اور جانے پہچانے کردار زندگی کے وسیع تناظر میں سوالیہ نشان بن کر ابھرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے۔ اور ان کے افسانوں کا اہم موضوع نسائی مسائل، روایتی جدید سماجی تناظر میں پیدا ہونے والے مسائل بھی ہیں۔ خالدہ حسین نے اپنی تحریروں میں اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدوں کو سماجی اصولوں کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کی ہے اور ان بنیادی مسائل کی طرف توجہ مبذول کروانے کی کوشش کی ہے جو بظاہر معمولی نظر آتے ہیں لیکن ان کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانوں میں سچی کہانیوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ عورت کے بنیادی حقوق اور تقاضے کی علمبردار بن گئی ہیں۔

۱۱ جنوری ۲۰۱۹ء کو منفرد اسلوب اور باکمال الفاظ کی حامل افسانہ نگار کی زندگی کا سفر تمام ہو گیا۔ ممتاز افسانہ نگار اور کہانی نویس کی زندگی کی کہانی ہی تمام نہیں ہوئی بلکہ اردو ادب کا ایک باب بھی بند ہو گیا ان کی موت کے حوالے سے بی بی امینہ کہتی ہے:

"خالدہ حسین کی مسلسل بگڑتی ہوئی حالت سے میں مسلسل آگاہ تھی۔ میں لگ بھگ ڈیڑھ سال سے موت کو ان کی جانب لپکتا دیکھ رہی تھی۔ ان کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ DIALYSIS پر تھیں۔ ان کا وزن بھی روز بروز گرتا جا رہا تھا۔ لیکن جب بھی ان کو ملنے جاتی ان کے سرہانے کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہوتی۔ لکھنا پڑھنا ہی ہمارا موضوع ہوتا۔ انہیں بیماری کے بارے میں بات کرنا بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔۔۔ خالدہ حسین جمعہ کی صبح انتقال کر گئیں۔ خالدہ حسین کا انتقال اردو ادب کے لیے ایک بڑا نقصان ہے۔"(۵۱)

خالدہ حسین اپنے اکلوتے بیٹے اور شوہر کی حادثاتی موت کے صدمے کی وجہ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو گئی۔ آپ طویل علالت کے بعد ۱۱ جنوری ۲۰۱۹ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔

حوالہ جات

۱۔ فاطمہ حسن، نسائی شعور ایک مابعد جدید رجحان (مضمون) مشمولہ، تانیثیت اور ادب، مرتبہ انور پاشا، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، س،ن، ص ۲۷۷

۲۔ خالد علوی، ڈاکٹر، اسلام کا معاشرتی نظام، الفیصل ناشران تاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۴۹۱

۳۔ تنویر انجم، عصمت چغتائی کا نسائی شعور (مضمون)، مشمولہ، فیمنزم اور ہم ادب کی گواہی، مرتبہ، فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۱۵

۴۔ کشور ناہید، ادب اور نسائیت (مضمون) مشمولہ، تانیثیت اور ادب، مرتبہ انور پاشا، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، س،ن، ص ۲۲۵

۵۔ ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، علامہ اقبال یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء، ص ۴۵۳

۶۔ فرزانہ کوکب، ڈاکٹر،، ملتان کے افسانوی ادب کی نمائندہ خواتین لکھاریوں کی تخلیقات میں تانیثی عناصر (مضمون) مشمولہ، دریافت، شمارہ، ۱۸، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئز، اسلام آباد، ص ۹۸

۷۔ تنویر انجم، نسائی تحریک کا ارتقاء (مضمون) مشمولہ، تانیثیت اور ادب، مرتبہ انور پاشا، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، س،ن، ص ۲۶۸

۸۔ ایضاً، ص ۲۶۸

۹۔ ایضاً، ص ۲۶۹

۱۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب ۱۹۹۴ حصّہ ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۵

۱۱۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، ڈاکٹر، کشاف تنقیدی اصطلات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۷۷

۱۲۔ جمیل جالبی، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۳۳۷

۱۳۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ ص ۵۸۹

۱۴۔ نورالحسن نیر، نوراللغات ج، قومی کونسل برائے فروغ روڈ، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۲۲۴

۱۵۔ خواجہ عبدالمجید، جامع اللغات ج، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۲۱۳

۱۶۔ ترنم ریاض، رسالہ سمت، شمارہ ۷، (مضمون) نسائیت اور نسائی ادب نمبر، ہم عصر شاعرات کے کلام میں تانیثی رویے، اپریل تا جون، ۲۰۰۷ء، ص ۲۷

۱۷۔ عظمیٰ فرمان، ڈاکٹر، نسائیت (مضمون)، مشمولہ، اردو ادب اور تانیثیت، مرتبہ، قاضی جاوید، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۵۹

۱۸۔ حمیرہ سعید، ڈاکٹر، اردو ناولوں میں نسائی حسیت، ایجوکیشنل پبلی کیشنز ہاوس، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۲۴

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۵

۲۰۔ حمیدہ معین رضوی، تخلیقی تنقید، کاروان ملت پبلی کیشنز اسلام آباد، س۔ن، ص ۲۸۴

۲۱۔ ایضاً، ص، ۲۵۱

۲۲۔ اصغر عباس، پروفیسر، سرسید تحریک کی نسائی حسیت، اردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ (مضمون)، مرتبہ، قیصر جہاں، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۰۶ء، ص ۹۴

۲۳۔ تنویر انجم، ڈاکٹر، عصمت چغتائی کا نسائی شعور (مضمون)، مشمولہ، فیمنزم اور ہم ادب کی گواہی، مرتبہ فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر کراچی، ۲۰۰۵، ص ۱۱۶

۲۴۔ عظمیٰ فرمان فاروقی، ڈاکٹر، اردو ادب میں نسائی تنقید روایت مسائل و مباحث، سعید پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶

۲۵۔ صغر امہدی، اردو ناولوں میں عورتوں کی سماجی حیثیت، سجاد پبلی کیشنز ہاوس نئی، دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۵۷

۲۶۔ شاہدہ حسن، نسائی حیثیت کا اظہار اور شعری پیرائے، (مضمون) مشمولہ، فیمنزم اور ہم ادب کی گواہی، مرتبہ فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵، ص ۱۵۲

۲۷۔ تنویر انجم، ڈاکٹر، عصمت چغتائی کا نسائی شعور (مضمون) مشمولہ، فیمنزم اور ہم ادب کی گواہی، مرتبہ فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص، ۱۲۰

۲۸۔ عقیلہ جاوید، ڈاکٹر، اردو ناول میں تانیثیت، شعبہ اردو بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۰ء

ص ۴۷، ۴۶

۲۹۔ مرتضیٰ علی اطہر، فہمیدہ ریاض کی شاعری میں جدید عورت، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۳

۳۰۔ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں، بک پوئنٹ باردوم، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۵۴

۳۱۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رفتہ و آیندہ (اردو ادب کا منظر نامہ)، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۵۱

۳۲۔ عقیلہ جاوید، ڈاکٹر، اردو ناول میں تانیثیت، شعبہ اردو بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۵ء، ۳۷

۳۳۔ سید حسین محمد جعفری، ڈاکٹر، مرتبین، پاکستانی معاشرہ اور ادب، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۶

۳۴۔ شاہدہ حسن، نسائی شعور (مضمون) مشمولہ، تانیثیت اور ادب، مرتبہ انور پاشا، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، س،ن، ص ۲۶۴

۳۵۔ نورین رزاق، ڈاکٹر، پاکستانی خواتین افسانہ نگار (اردو افسانے کی روایت کے تناظر میں)، دستاویز مطبوعات ،لاہور، س۔ن، ص ۴۵

۳۶۔ مولانا سید جلال الدین عمری، اسلام کا عائلی نظام، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۲

۳۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستان شاعرات تخلیقی خدوخال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۵۱۵

۳۸۔ سیما صغیر، ڈاکٹر، تانیثیت اور اردو ادب روایت، مسائل اور امکانات، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۳۹۔ اکبر ایس احمد، پاکستانی معاشرہ جنوبی ایشیا میں اسلام نسل پرستی اور قیادت، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۸ء، ص ۶۹

۴۰۔ سید جلال الدین انصر عمری، عورت اسلامی معاشرے میں، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹیڈ، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۳

۴۱۔ بادشاہ منیر بخاری، اردو ادب میں عورت کا تصور (مضمون) مشمولہ: ادب کی نسائی ردِ تشکیل، مرتبہ، فہمیدہ ریاض، ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۷

۴۲۔ بی بی امینہ، خالدہ حسین شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء ص ۱۵

۴۳۔ آصف فرخی، دنیازاد، کتابی سلسلہ ۱۴۵، اے بی پرنٹنگ سروسز، کراچی، ۲۰۱۷، ص ۲۰۹

۴۴۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۱۸۷

۴۵۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور علامت نگاری، ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۵۹

۴۶۔ بی بی امینہ، خالدہ حسین شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۲۲

۴۷۔ زینت افشاں، ڈاکٹر، اردو فکشن پر سقوطِ ڈھاکہ کے اثرات، ادارہ یادگارِ غالب، کراچی ۲۰۱۶ء، ص ۱۳۳

۴۸۔ بی بی امینہ، خالدہ حسین سے گفتگو (انٹرویو) اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۱۳۷

۴۹۔ انتظار حسین، علامتوں کا زوال، مضمون (خالدہ حسین کی پہچان)، مکتبہ نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۲۹

۵۰۔ عصمت جمیل، ڈاکٹر نسائی شعور کی تاریخ اردو افسانہ اور عورت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۳

۵۱۔ بی بی امینہ، راقمہ سے گفتگو، بمقام، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، وقت ۱۱:۱۵ بدھ بتاریخ: ۱۵ دسمبر ۲۰۱۹

باب دوم

خالدہ حسین کے افسانوں میں روایتی سماجی تناظر اور نسائی مسائل: تجزیاتی مطالعہ

روایتی سماجی تناظر اور نسائی مسائل کے حوالے سے خالدہ حسین کا نام اہم ہے۔ خالدہ حسین نے تمثیلی انداز کو اس طرح سے برتا ہے کہ مختلف تہذیبی اور ثقافتی مسائل کے ذریعے انھوں نے اپنی تحریروں میں نسائی مسائل کی عکاسی کی ہے۔ خالدہ حسین نے تجریدی، امیجری اور علامت کے رجحانات کو اس انداز سے برتا ہے کہ اس میں تہذیبی مزاج، زمین، روایات کا تعلق استوار نظر آتا ہے۔ دنیا کی کسی بھی زبان کا ادب اٹھا کر دیکھے تو عورت ہمیشہ سے ہی موضوع رہی ہے۔ داستان، ناول، افسانہ کوئی کہانی اس کے بغیر مکمل نہیں ہے۔ داستان کا زمانہ تھا تو عورت شہزادی، کنیز، دیوی اور پری ہوتی تھی۔ اس کے باوجود ہندوستانی عورت ماں، بیٹی، بہن کی صورت میں زیادہ بہتر دیکھائی جاتی۔ عورت کی فطرت کے مختلف پہلو، کردار کے خدوخال، نفسیاتی کشمکش عورت کے بارے میں مخصوص تصورات اور توہمات داستان میں جاری و ساری رہتے ہیں۔ وہ دعا مانگتی نظر آتی ہے۔

روایتی معاشرے سے مراد وہ معاشرہ ہے جو قدیم روایات کا امین ہوتا ہے۔ کسی بھی قسم کا ردبدل بھی ان روایات میں نہیں کرنا چاہتا ہے۔ اپنے بزرگوں کی رسم و رواج کی پابندی میں فخر محسوس کرتا ہے۔ روایتی معاشرے کی عورت صدیوں سے ہی محکومی کا شکار رہی ہے۔ اس کو رائے دینے کا حق نہ تھا۔ کبھی اپنا نقطہ نظر بیان نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ عورت کے حقوق پر بات کی جانے لگی۔ اکیسویں صدی کی نمائندہ ادیب خواتین کی بات کی جائے تو عورتوں کے حق میں آواز بلند کرنے میں نمایاں نام خالدہ حسین کا آتا ہے۔ خالدہ حسین نے اپنی تحریروں میں کچی عمر کے خوابوں، گھریلو ماحول کی عکاسی اور خانگی زندگی کے مسائل پر قلم اٹھایا۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنی والی عورتوں کے مسائل کو بیان کیا۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانوں

میں ایک ایسی عورت کو پیش کیا ہے جو با شعور اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اپنی پسند کی زندگی گزار نہیں سکتی۔ پڑھی لکھی نازک لڑکیاں زمینداروں سے دولت کی لالچ میں بیاہ دی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر مرتضیٰ علی اطہر لکھتے ہیں:

> "مردوں کی بالادستی والے سماج کی پیدا کردہ بہت سی خصوصیات دوسرے ایشیائی ممالک کی طرح یہاں بھی موجود ہے۔ جہیز کا رواج، خانگی مسائل، تشدد عصمت دری اور جنسی استحصال جیسی برائیاں ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں لیکن پاکستان کی انفرادیت یہ ہے کہ سماجی جبر کے ساتھ ساتھ سیاسی جبر اور آمریت کے غیر جمہوری نظام کی موجودگی نے یہاں عورتوں کی حالت اور بھی زیادہ نازک کر دی ہے۔"(۱)

طبقاتی کشمکش اور قدیم روایات کی شکار عورت خالدہ حسین کا محبوب موضوع ہے۔ انھوں نے معاشرے کی بے بس عورت کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ ایسی عورت جو نہ صرف معاشی نظام کا شکار ہے بلکہ مرد کی طاقت کا بھی شکار ہوتی ہے۔ روایتی معاشرے کے اندر عورت ایک شے کی طرح زندگی گزرانے پر مجبور ہے۔ معاشرے میں عورت کی حیثیت ایک بے جان شے کی مانند ہوتی ہے۔ اپنی مرضی سے عورت زندگی بسر نہیں کر سکتی اور نہ ہی اپنی خواہشات کا اظہار کر سکتی ہے۔

خالدہ حسین کی کہانیوں میں عورت کا باطنی قرب، ذہنی کیفیات، صنف نازک کا احساس اور عدم تحفظ بنیادی موضوع ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں میں گھریلو ماحول، جانے پہچانے کردار، فنکارانہ برتاؤ، سرمایہ درانہ نظام کے سبب ماورائی فضا میں زندگی کے وسیع تناظر میں سوالیہ نشان بن کر پھیل جاتے ہیں۔ ان کے موضوعات روایتی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ عورت اور مرد کائنات کے ہم معنی اجزاء ہیں۔ دونوں کا تعلق جسمانی اور سماجی رشتوں میں ایسا الجھا ہوا ہے کہ اس رشتے کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔ ان رشتوں میں سلجھاؤ اور الجھاؤ آدم سے جاری و ساری ہے۔ خالدہ حسین نے اس رشتے کو ان رسوم سے الگ کر کے دیکھا ہے خالدہ حسین نے اپنی کہانیوں کا تانہ بانہ بھی انہی کے گرد بنا ہے۔

ڈاکٹر حمیرا اشفاق لکھتی ہیں:

"خالدہ حسین اردو افسانے میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ان کی کہانی کے کئی رنگ و آہنگ ہیں۔جس کی واضح دلیل ان کے افسانوں کا موضوعاتی تنوع ہے۔تانیثیت، تصوف کی پر پیچ گھاٹیاں ،وجودی فلسفہ ،دیگر مغربی تحریکوں کے اثرات ،عصری حقائق کی عکاسی ،اقدار کی تنزلی اور علامت نگاری ،ان تمام رویوں کو اپنانے کے باوجود ان کی تحریر عدم ابلاغ کا شکار نہیں ہوتی۔"(۲)

خالدہ حسین نے اپنے بیشتر افسانوں میں جہاں دیگر موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہاں ان کے افسانوں کا اہم موضوع روایتی معاشرے میں نسائی مسائل بھی ہیں۔روایتی معاشرے کے حوالے سے خالدہ حسین نے دیہات کی غریب اور مظلوم لڑکیوں کو موضوع بنایا ہے جن کا مردوں کے ہاتھوں استحصال ہوتا ہے۔اس موضوع کو خالدہ حسین نے مختلف حوالوں سے پیش کیا ہے۔خالدہ حسین کے افسانوں میں عورت کی روح کا کرب موجود ہے۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانوں میں غریب گھرانوں کی لڑکیوں کی شادی کے مسئلے کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس موضوع پر خالدہ حسین کے ایک سے زیادہ افسانے ملتے ہیں۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانوں میں سرمایہ درانہ نظام میں درمیانے طبقے کی عورتوں کے حالات کو بیان کیا ہے کہ درمیانے طبقے کی عورت کو بمشکل ضروریات زندگی میسر آتی ہیں جس کی وجہ سے عورتیں اپنے خاندان کو لباس پہنانے، کھانا کھلانے اور گھر کو صاف کرنے میں گھریلو غلاموں کی طرح مزدوری کرتی ہیں لیکن اس سب کے باوجود مرد عورت کو اپنا ساتھی سمجھنے کے بجائے جنسی تسکین کا موجب سمجھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ دیہی معاشرے کا مرد اپنی عمر کو بھی خاطر میں نہیں لاتا ہے اور کم عمر لڑکیوں سے شادی کر کے ان پر حکمرانی کرتا ہے اور لڑکیوں کو غلام بنا کر رکھتا ہے۔خالدہ حسین نے اپنے افسانوں میں دیہی معاشرے کی خواتین کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔

الف) روایتی اعتقادی نظام اور توہم پرستی

خالدہ حسین نے روزمرہ زندگی میں پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ خالدہ حسین اپنے

موضوعات عام زندگی سے چنتی ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں روایتی اعتقادی نظام اور توہم پرستی کی شکار خواتین کی عکاسی کی ہے۔ روایتی اور اعتقادی نظام اور توہم پرستی کی عکاسی اپنے افسانے "ایک بوند لہو کی" نامہ بر" اور" آخری سمت" میں کی ہے۔خواتین تعلیمی شعور کی کمی کے باعث توہم پرستی میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ قدیم روایات سے جکڑی ہوئی عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی کی ہے۔ دیہی معاشرے کے اندر جنات، جادوں ٹونہ اور تعویذ گنڈے کا رواج عام ہے۔ تعلیمی شعور کی کمی کے باعث خواتین اپنے مسائل کا حل عامل حضرات اور پیروں فقیروں میں تلاش کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ ذہنی خلل میں مبتلا رہتی ہیں۔

خالدہ حسین داخلیت اور خارجیت کے ملاپ سے افسانہ بُنتی ہیں۔ جو داخل ہے وہ خارج ہے۔ جو خارج ہے وہ داخل ہے۔ جس سے قاری غور و فکر کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کی عورت خوف، پرانے تصور و روایات ، اعتقادی اور توہم پرستی سے دوچار نظر آتی ہے۔وہ جدید افسانہ نگاروں میں منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانوں میں داخلی خارجیت کی طرح ڈالی ہے۔ داخلیت اور خارجیت کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں روایتی معاشرے میں عورتوں کے مسائل کو بڑی عمدہ انداز میں بیان کیا ہے۔ڈاکٹر اعجاز راہی لکھتے ہیں:

> "خالدہ حسین کے ابتدائی افسانوں میں یہ حیرت سیال شکل میں پر اسراریت کے منقطوں میں ظاہر ہوئی اور رفتہ رفتہ فلسفیانہ آہنگ سے اس کا گراف ایک نئی سمت میں اوپر اٹھتا ہوا صوفیانہ انداز نظر کا حامل بنتا چلا گیا۔۔۔اور اس کے کردار ایک مسلسل کرب میں سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں۔ خون، خوف اور دہشت کی علامتیں مختلف انداز اور صورتوں میں جلوہ گر ہو کر افسانے کے منظر نامے میں کامیاب رہی ہیں۔"(۳)

خالدہ حسین کا افسانہ "ایک بوند لہو کی" ایک شاہکار افسانہ ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار "ماں" کا ہے جو تعلیمی شعور کی کمی کے باعث اپنے مسائل کا حل پیر مریدوں میں تلاش کرتی ہے۔ ہمارے روایتی معاشرے کے اندر پیر مریدی ایک اہم مسئلہ ہے۔ اور اسی مسئلے کی عکاسی خالدہ حسین نے اپنے افسانے کے

اندر کی ہے۔ روایتی معاشرے کے اندر پیروں پر اندھا یقین ایک اہم مسئلہ ہے۔ کچے ایمان کے پڑھے لکھے لوگ بھی روزانہ جعلی پیروں کے ہاتھوں اذیت ناک تکلیف اٹھاتے ہیں اور اُف بھی نہیں کرتے۔ اکثر اوقات ان پڑھ پیروں کے ہاتھوں اپنی جانیں تک گنوا دیتے ہیں۔ جہالت کی شرح اتنی بڑھ گئی ہے کہ تعلیمی شعور کی کمی کے باعث سوچ بچار سے کام ہی نہیں لیا جاتا ہے۔ جعلی پیر دیہاتوں میں درندوں کی طرح لوگوں کی جانوں سے کھیل جاتے ہے۔ دیہاتوں کی خواتین کھرے کھوٹے کا فرق محسوس کیے بغیر پیروں پر یقین کرتی ہیں۔ جو پیر کہتے ہیں وہی سچ ہوتا ہے اور اکثر اوقات اپنی ساری جمع پونجی بھی پیروں پر نچاور کر دیتی ہیں۔

دیہات کی سادہ لوح خواتین پیروں کے چنگل میں آسانی سے پھنس جاتی ہے۔ پیر ان سے جو امور بھی سر انجام دینا چاہیں دے سکتے ہیں۔ دیہاتوں میں جو شخص کسی پیر کا مرید نہ ہو اسے بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ایمان صرف اسی وقت محفوظ ہو سکتا جب آپ کسی پیر کے مرید ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں انسان متقی اور پرہیز گار صرف اسی صورت میں بن سکتا ہے جب وہ کسی کامل پیر کا مرید بن جاتا ہے۔

پاکستان میں جعلی پیروں کی اصطلاح ایسے شخص کی ہے جو کرشمہ سازی اور طاقت کا دعویدار ہو، جس کا تعلق وہ کسی طرح دین اسلام سے جوڑتے ہیں۔ دیہات کی توہم پرست اور جاہل عورتوں کی کثیر تعداد ان کو اللہ کا ولی سمجھتے ہوئے ان کی مرید ہو جاتی ہے۔ جعلی پیر کے کچھ غنڈے خواتین کو مرغوب کرتے ہیں۔ جعلی پیر تعویذ گنڈے کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ خواتین کو بتاتے ہیں کہ ان پر اور ان کے گھر کے کسی بھی فرد پر جنات کا سایہ ہو گیا ہے اور وہ جنات کو بھگانے کا علم جانتے ہوئے ان کا جنات سے چھٹکارا دلوا سکتے ہیں۔ بعض بد کردار بھی ہوتے ہیں۔ ان سب کاموں کے لیے خواتین سے پیسے بھی وصول کرتے ہیں۔ بعض پیر جنات کو اپنے قبضے میں بتاتے ہیں اور سائلوں کا ان کی مدد سے کوئی بھی کام کروا لینے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جاہل عورتوں کے ذہین میں قرآنِ مجید میں مذکور حضرت سلیمان علیہ السلام اور جنات کے تذکروں کو ان پیروں سے جوڑ کر ان کی اندھی تقلید میں لگا دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

خالدہ حسین نے بھی اپنے افسانے "ایک بوند لہو کی" میں پیر مریدی کے مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔اس افسانے کی مرکزی کردار جو ماں کا ہے۔ماں جو اپنے بیٹے کی وجہ سے بہت پریشان رہتی ہے۔ماں جس کا بیٹا مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے اور بیٹے کی روز بروز بگڑتی حالت سے ماں بہت پریشان ہوتی ہے اور بیٹے کو کہتی ہے کہ اس کی بیماری کا علاج صرف پیروں کے پاس ہی ہے۔ایک دن جب بیٹا گھر آکر ماں کو بتاتا ہے کہ وہ آج پیروں کے پاس گیا تھا تب ماں بہت خوش ہوتی ہے۔ماں کو لگتا ہے نظر لگنے اور جادوں ہونے کی وجہ سے تمام مسائل پیدا ہوئے ہیں۔

تعلیمی شعور اور وسائل کی کمی وجہ سے دیہی خواتین اپنے مسئلے کا حل پیروں سے کرواتی ہیں۔ اس افسانے کی مرکزی کردار "ماں" تکلیف دہ حالت میں ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔اپنے شوہر اور بچوں کی ہر وقت خدمت کرتی ہے۔ماں کو اپنی پروا نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنی ساری زندگی اپنے بچوں اور شوہر کے لیے وقف کر دیتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی اس کی معاشرے کے اندر کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ افسانے کی مرکزی کردار اپنے بیٹے "ناہید ظہیر الدین" سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ماں خود بیمار ہونے کے باوجود اپنے دکھ کو بھلا کر اپنے بیٹے کے لیے پریشان رہتی ہے۔ لیکن جب بیٹا ماں کو بتاتا ہے کہ وہ پیروں کے پاس گیا تھا تو ماں بہت خوش ہوتی ہے۔ماں کو لگتا ہے کہ اس کا بیٹا راہ راست پر آگیا ہے۔ تعلیمی شعور کی کمی کے باعث ماں پرانے عقیدے پر ہی یقین رکھتی ہے ماں کے اسرار کرنے پر آخر کار بیٹا پیروں کے پاس چلا جاتا ہے اور جب ماں کو بتاتا ہے تو اسے یوں لگتا ہے کہ جیسے اسے تمام جہاں کی خوشیاں نصیب ہو گئی ہیں:

> "وہ ماں کو بتایا ہے کہ ایک مستطیل کمرے میں لوگ جمع تھے گھٹی ہوئی گرم فضا میں آکر بتیوں کی مہک اڑ رہی تھی۔ کھڑی کے قریب شاہ صاحب سفید کپڑوں پر ہری شال اوڑے بیٹھے تھے اور لوگ صحن سے کھڑی میں جھک کر ان کا ہاتھ چوم رہے تھے۔ شاہ صاحب نے اپنا نسوں بھرا ہاتھ میرے سر پر بھی رکھ دیا"(۴)

خالدہ حسین نے اپنے افسانے "ایک بوند لہو کی" کے اندر ایک ایسی عورت کی عکاسی کی ہے جو اپنے دکھ درد اور وجود کو بھلا کر اپنی تمام زندگی اپنے بچوں کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ماں کی پیروں سے خاص

عقیدت ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ اس کی تمام مشکلات کا حل پیروں کے ذریعے ہو جائے گا۔ اس طرح وہ مذہبی احکامات بالائے طاق رکھ کر صرف اور صرف پیروں سے ہی اپنے مشکلات کا حل نکالنا چاہتی ہے۔ عملی زندگی میں ماں اور بیٹے دونوں مذہبی احکامات پر عمل نہیں کرتے۔ وہ اپنے بیٹے کو بار بار پیروں کے پاس جانے کے لیے اصرار کرتی ہے۔

جب بیٹا ماں کے بار بار اصرار سے پیروں کے پاس چلا جاتا ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ وہ سمجھتی ہے کہ اب وہ وقت آگیا کہ اس کا بیٹا راہِ راست اور صراط مستقیم پر آگیا ہے۔ علم و شعور کی کمی کے باعث روایتی سماج کی خواتین فرسودہ رسم و رواج میں جکڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہم، توہم پرستی اور سادہ لوحی کی شکار خواتین دیہی معاشرے میں بکثرت نظر آتی ہیں۔

نفسیات ایک ایسا علم ہے جس کے تحت بنیادی طور انسان کی دماغی اور ذہنی زندگی کے مختلف پہلو سے بحث کی جاتی ہے۔ نفسیات ایک ایسی سائنس ہے جس کے تحت ایک فرد کے دماغی، ذہنی خیالات، احساسات، کردار اور اس سے سرزد ہونے والے مختلف افعال پر بحث کی جاتی ہے۔ اس کے تحت انسان کی ذہنی زندگی کے مختلف پہلو زیرِ غور آتے ہیں۔ نفسیات میں فرد اور سماج کے تعلق سے افعال پر بحث کی جاتی ہے۔ فرد کی سماجی زندگی، رسم و رواج، عادات و اطوار اور فرد کا رشتہ اپنے ماحول جیسے مسائل پر بحث ہوتی ہے۔

افسانہ "نامہ بر" میں خالدہ حسین نے ایک ایسی عورت کی نفسیاتی کشمکش کی تصویر کشی کی ہے، جو توہم پرستی اور آسیب کا شکار نظر آتی ہے۔ کسی بھی فرد کی زندگی میں تعلیم نسواں انتہائی اہم ہے کیونکہ اس کے بغیر معاشرے میں تعلیمی روائیوں اور مثبت روائیوں کا تصور محال ہے۔ روایتی معاشرے میں عورت اپنے عقل و شعور کا مکمل ادراک اور اپنی ذات کی آگاہی سے محروم ہوتی ہے۔ یہ عورت دکھی نظر آتی ہے۔ ان کے افسانے "نامہ بر" میں موجود کردار ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہا ہے جو تعلیمی شعور نہ ہونے کے باعث فرسودہ رسم و رواج میں جکڑا ہوا ہے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

"خالدہ حسین کی کہانی ایک فنی پیچیدگی سے جنم لیتی ہے۔ جس سے کئی پرتیں پیدا ہوتی ہیں۔ بنیادی طور پر ان کا طریقہ کار خارج کے مواد کو ذات کی گہرائیوں میں لے جا کر ایک نیا روپ عطا کرنے سے عبارت ہے۔۔۔۔ چوں کہ وہ ایک کہانی کار ہیں اس لیے ان کے اظہار میں صوفیانہ الجھاؤ نہیں بل کہ ایک رواں انداز ہے۔ جو ان کے تجزیے اور مشاہدے کو کہانی کے رگ و پے میں اس طرح سمو دیتا ہے کہ کہانی ان کی قلبی واردات کا حصہ بن جاتی ہے۔"(۵)

اس افسانے کی مرکزی کردار کو یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی دوسری روح اس کے اندر پل رہی ہے۔ کوئی بھی پیر یا فقیر کچھ بھی بول دے تو وہ ان کے لیے حرف آخر ہوتا ہے۔ وہ اپنا عقل اور شعور استعمال کرنے کے بجائے ان پر اندھا دھند یقین کر لیتی ہیں کہ جو کچھ یہ بول رہا ہے وہ حرف آخر ہے۔ ان کی اپنی سوچ اور تحقیق اس حوالے سے نہیں ہوتی۔ جس کی وجہ سے محض مرد ہی استحصال نہیں کر رہا ہوتا۔ بلکہ انسان کے ہاتھوں انسانیت کا استحصال جاری ہے۔ روایتی سماج کے اندر پیر مریدی پر یقین ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اپنے وہم اور فرسودہ رسم ورواج کی وجہ سے وہ کوئی شعور نہیں رکھتی۔ ایک دن اس کے دروازے کے باہر جب کوئی اسے بلاتا ہے۔ تو اسے یہ کہا جاتا ہے کہ کہ سبز گنبد والا اس کو بلا رہا ہے۔

"گرمیوں کی اس خاموش دوپہر جب گھنٹی بجی تو مجھے معلوم ہوا کہ کوئی مجھے باہر بلاتا ہے۔۔۔ بی بی وہاں کیا کھڑی ہے آگے نکل۔ اس دہلیز سے باہر نکل تیرے نام پیغام آیا ہے سبز گنبد کے حضور سے سنا تو نے۔۔۔

ایک دشمن ہے بی بی تیری۔۔۔ تیری جیسی چال ڈھال۔ ناک نقشہ دم دم کی خبر رکھنے والی۔ تیرے ساتھ سایہ کی طرح لگی ہے اس سے خبردار رہ بچہ وہ تیرے سچے حرف مٹانے کی فکر میں ہے شاہ عنایت اس کی بُو پا کر لوٹ جاتے ہیں۔ مگر اب یہ تیرا مقدر ہیں"(۶)

روایتی معاشرے کی عورتوں کو یقین کروایا جاتا ہے کہ جو کچھ اس کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے، وہ اسے

نصیب سمجھ کر قبول کرے اور اس نصیب سے گلہ نہ کرے۔ کیونکہ جو کچھ نصیب میں ہوتا ہے وہ اس کو مل کر ہی رہتا ہے۔ چاہے وہ اس کے لیے کوشش کرے یا نہ کرے۔ اس طرح اس کے نصیب پیروں کی دعاؤں سے جڑے ہیں۔ پیروں کے ساتھ عقیدت ہی نصیب کو چار چاند لگا سکتی ہے اور جس پر سبز گبند والے پیر نگاہ کریں اس کی قسمت جاگ اٹھتی ہے۔ اس لیے پیروں کے حکم کو حرف آخر مان کہ سر تسلیم خم کرنا ہی اس کے مقدر اور اچھے نصیب کے لیے ضروری ہے۔ فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

> "خالدہ حسین کے افسانے اردو نثر میں نادر و نایاب مظہر ہیں۔ مشرق کی سرزمینوں میں شاعری کی ساحری اور پیغمبری سے نسبت زمانہ قدیم سے چلی آتی ہے۔ اب خالدہ حسین نے افسانہ نگاری کو جزویت از پیغمبری کا مقام دے دیا ہے۔"(۷)

"آخری سمت" میں خالدہ حسین نے ذات کو معاشرتی اور اخلاقی پابندیوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ معاشرے کے اندر خارجی مسائل جزوی اور کلی سطح پر اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی وجہ سے فرد داخلی اور خارجی سطح پر منتشر نظر آتا ہے۔ اس افسانے کی مرکزی کردار نفسیاتی کشمکش کا شکار نظر آتی ہے۔ بنیادی طور پر عقلی زندگی اور رویئے کے سائنسی مطالعے کو نفسیاتی مطالعہ کہا جاتا ہے۔ عقلی زندگی اور اس کے حیاتیاتی افعال انجام دینے کی نہیں بلکہ عقلی زندگی کی ہے۔ نفس کے مطالعے کا نام نفسیات ہے۔ نفسیات ایک وسیع علم ہے جو صرف انفرادی علاج معالجے تک محدود نہیں بلکہ اس میں جانداروں کی عقل اور انسانی روائیوں پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ افسانے کی مرکزی کردار جو تصویر کے تعاقب میں وہم، خوف، ڈر اور تذبذب کا شکار ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش لکھتی ہیں:

> "خالدہ حسین کی کہانیاں عصری شعور سے کما حقہ، لبریز گہری فکر اور اسلوب کے امتزاج سے سامنے آتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں صنف نازک کا احساس عدم تحفظ بنیادی موضوع ہے۔ اس کے باوجود ان کے بیشتر افسانوں میں گھریلو ماحول جانے پہچانے کردار فن کارانہ برتاؤ کے سبب تجریدی اور ماورائی فضا بندی کرتے ہوئے زندگی کے وسیع تناظر میں سوالیہ نشان بن کر پھیل جاتے ہیں۔ ان کے موضوعات

عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور انہی کے گرد انھوں نے اپنی کہانیوں کا تانا بانا بنا ہے۔"(۸)

(ب) تمدنی عادات اور رسوم ورواج

کسی معاشرے کا، کسی تہذیب کا اوڑھنا بچھونا، میل ملاقات، معاملات، تجارت، رہن سہن اور اس سے جڑی ہوئی چیزیں وہ سب تمدن کے ذیل میں آتی ہیں۔ ہر معاشرے کا اپنا اپنا تمدن ہوتا ہے۔ تمدنی عادات اور رسم و رواج کی شکارخواتین کی عکاسی اپنے افسانوں "آخری سمت"، "دھوپ چھاؤں "، "دہان زخم"، جھاڑوں میں کی ہے۔

خالدہ حسین نے افسانہ "آخری سمت" میں عورت کے ذہنی روئیوں اور رسوم ورواج کو موضوع بنایا ہے۔ حالات واقعات کے انسانی زندگی پر اثرات اور انسان کے نفسیاتی کشمکش کی عکاسی کی ہے۔ نفسیات کی وسعت کا تعلق عقل سے تعلق ہونے کی وجہ سے اس کا دائرہ انتہائی وسیع اور ہمہ گیر ہوتا ہے۔ نفسیات ایک سائنسی مطالعہ ہے جس میں ایک تجرباتی طریقے، ایک منظم اور با مقصد جاندار مطالعہ کیا جاتا ہے اور نفسیات میں روایوں کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے اور اس کے دائرے میں جانداروں کی زندگی کے تمام عمل اور رد عمل آجاتے ہیں۔ نفسیات کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ سائنسی طریقوں سے کردار اور ذہنی اعمال کے درمیان تعلق کو معلوم کرنا اور سمجھنا ہے۔ نفسیات دان افراد کا مخصوص کردار سائنسی مشاہدے کے مدد سے جانچ کر بیان کرتے ہیں۔ انتظار حسین لکھتے ہیں:

> "خالدہ حسین کے افسانوں میں حقیقت کچھ وہ ہے جو نظر آرہی ہے، کچھ وہ ہے جو نظروں سے اوجھل ہے۔ آدمی یہاں بھی ہے اور کہیں اور بھی ہے۔۔۔ خالدہ حسین کو اوپر سے علامت کا رنگ چھڑکنے کی ضرورت پیش نہیں آتی ہے۔"(۹)

روایتی سماج کے اندر عورتوں کو گھروں کے اندر دبا کر رکھا جاتا ہے۔ چار دیواری میں رکھ کے داخلی اور خارجی سطح پر خوف میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ ثقافتی، مذہبی، معاشرتی اور سماجی پابندی عائد کر کے عورتوں کو دبایا جاتا ہے۔ مرد گھر کے اندر ہو یا باہر ان کا خوف حاوی رہتا ہے۔ اس کی عکاسی خالدہ حسین نے اپنے

افسانے "آخری سمت" میں کی ہے۔ اس افسانے کی مرکزی کردار ہر وقت تصویر کے تعاقب میں رہتی ہے۔ یہ تصویر بڑے ابا کی تھی۔ جن کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ایک عرصہ بیت گیا لیکن ان کا خوف، رعب اور دبدبہ ابھی اس کے ذہن پر حاوی ہے۔

افسانے "آخری سمت" کی مرکزی کردار کو گھر کے اندر اور باہر ہر جگہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تصویر اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے سانس بھی لینے کا اختیار نہیں رکھتی۔ ہمارے روایتی سماج کے اندر خواتین کا گھروں سے باہر نکلنا اور اپنی مرضی کی زندگی بسر کرنا انتہائی دشوار اور مشکل ہو جاتا ہے افسانہ "آخری سمت" میں خالدہ حسین نے اخلاقی اور معاشرتی پابندیوں کے ساتھ بدلتی عمر کی ترجیحات کو نفسیاتی رد عمل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ماضی کی یادوں اور حال کے تناظر میں افسانے کی مرکزی کردار کرب اور خوف کی نمائندگی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

> "میں چلوں گی تمہارے ساتھ۔۔۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا اور اس کے ساتھ ابا کا چہرہ اس کی نظروں میں گھوم گیا۔ جو اسے بغیر اجازت کہیں آنے جانے سے اتنی سختی سے منع کرتے تھے اور پھر افی جو کچھ دنوں سے اسے معلوم نہیں اتنی مشکوک نگاہوں سے کیوں دیکھنے لگا تھا۔ وہ ہر وقت طرح طرح کی جاسوسی کرتا پھرتا رہتا تھا۔ اور اماں جو کسی کو پل بھر دیر ہو جاتی تو آیت الکرسی پھونک پھونک کر باؤلی ہو جاتی (۱۰)"

روایتی سماج کے اندر خواتین کو چار دیواری میں رکھنے کا رواج ابھی تک قائم ہے۔ اپنی مرضی سے کہیں بھی جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانے "آخری سمت" میں مردانہ ذہین کی عکاسی کی ہے کہ معاشرے کے اندر مرد ہمیشہ خود مختار رہنا چاہتا ہے۔ لیکن عورت کو بیچارگی اور مظلومیت کی جیتی جاگتی تصویر سمجھتا ہے۔ تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے عورت کو گھر کی چار دیواری میں بے جا رسم و رواج کی وجہ سے گھر کے اندر ایک شئے کی حیثیت سے قید کیا جاتا ہے۔ جس کو اپنی مرضی سے سانس لینے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس کی قابلیت اور صلاحیتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس طرح بعض

اوقات ایک نااہل مرد ایک قابل اور باصلاحیت عورت کی قسمت کا فیصلہ اپنے معیار اور پیمانے پر کر کے اس کی جیتی جاگتی زندگی کو جہنم میں ڈال دیتا ہے۔ جس سے وہ ساری زندگی اس عذاب اور مصیبت میں مبتلا رہتی ہے۔ اور اس طرح اس کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔

"گھر پہنچی اماں دروازے میں کھڑی تھی اور افی سکوٹر لیے کہیں جانے کو تیار تھا اور اپو سے جانے کیسی کیسی تفتیش کر رہا تھا۔ کہاں رہ گئی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر وہ سختی سے بولا۔۔۔ اس وقت اس کے جسم کا ہر رواں بے آنکھ کی نگاہ بن چکا تھا۔ اور اس کی کڑی نظر بندی میں وہ سب کچھ بولتی جا رہی تھی اور بڑے ابا کی نظریں اتنی دور دور جانے کہاں پھیلی تھیں۔ جبکہ ان کا اس سے کسی بھی چیز سے کچھ بھی تعلق نہ تھا۔"(۱۱)

روایتی معاشرے کے اندر عورتوں کو گھر کی باندی تصور کیا جاتا ہے اور ان کی حرکات کو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ روایتی معاشرے میں عورت شکنجوں میں کھنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ جدید زمانے میں بھی دیہی خواتین بھی قدیم مسائل سے دوچار ہیں۔ خالدہ حسین کے افسانوں کی عورت عدم تحفظ، نفرت کا شکار نظر آتی ہے۔ درمیانے طبقے سے اس کے خدوخال نظر آتے ہیں۔ یہ جانے پہچانے کردار فنکارانہ تدبیر کاری کے سبب زندگی کے تناظر میں ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آتے ہیں۔

"مگر جب وہ سکوٹر کی پچھلی سیٹ پر افی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی تو یکدم ایک عجیب بے چینی اور خوف نے اسے گھیر لیا۔ ہم یوں بھی تو کر سکتے ہیں کہ یہاں نہ آئیں لوٹ جائیں کر سکتے ہیں ناں۔ یہ تو نہیں کہ نہیں کر سکتے اور تیر اگلا بھی تو گھونٹ سکتے ہیں ناں۔ افی نے سکوٹر کا رخ گھر کی طرف موڑتے ہوئے کہا اور غصے میں آکر سکوٹر کی رفتار بے حد تیز کر دی اس کا جی چاہا راہ چلتے لوگوں اور گاڑیوں اور مکانوں میں مصروف انسانوں اور سینما گھروں میں تماشائیوں اور جہاں جہاں کوئی ہے تمام دنیا کو موجود لمحے اور اس کی سمت سے نجات دلا دے"(۱۲)

خالدہ حسین کے افسانوں میں موجودہ عورت اپنی ذات کے اثبات تشکیک، بے جا پابندیوں اور نہ ہونے کے احساس میں سمٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ خالدہ حسین کے افسانوں میں موجود عورت زندگی کے

معاشرتی مسائل ،زندگی کی بے معنویت اور بے مقصدیت کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ خالدہ حسین کا افسانہ "دھوپ چھاؤں" عورت کی بے معنویت کو پیش کرتا ہے۔ یہاں وہ اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے کھڑکی سے باہر جانے والے لوگوں کو دیکھتی رہتی ہے۔اس افسانے میں مرکزی کردار "مریم آپا" کا ہے۔ جو ہر وقت گھریلو کام کاج میں مصروف ہے۔اس کی نظر ہمیشہ گلی میں گزرنے والے لوگوں پر ہوتی ہے کہ سب کہاں جارہے ہیں۔ روایتی سماج کے اندر عورت کو چار دیواری کے اندر ایسے قید کیا جاتا ہے کہ ان کو باہر کی دنیا کا ہوش بھی نہیں ہوتا۔چادر اور چار دیواری میں محبوس عورت اپنے وجود کا جواز آج بھی ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔

"اگلے دن لکڑی کی دیوار کے پار غیر معمولی خاموشی تھی۔اس نے دیوار کے ساتھ
کان لگا کر سنا۔ چلنے پھرنے کی بڑی محتاط آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ بغیر کہیں دور گہرائی
سے کوئی چیخ اٹھی جسے کوئی کنویں میں سے بول رہا ہو۔"(۱۳)

خالدہ حسین نے عورت کی بے بسی کو اپنے جدید علامتی اسلوب میں اس طرح ڈھالا ہے کہ عورت کا وجود ہمارے سامنے ایک سوالیہ نشان کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ خالدہ حسین کے ہاں عورت اپنے روایتی مفہوم کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ خالدہ حسین کے افسانوں کی عورت عدم تحفظ، تشکیک اور نفرت کی شکار نظر آتی ہے۔ درمیانے طبقے سے خدوخال ابھرتے ہیں۔ جانے پہچانے کردار فنکارانہ تدبیر کاری کے سبب ماورائی فضائیں تبدیل ہو کر زندگی کے تناظر کو وسیع کرتے ہیں۔

روایتی سماج کے اندر نسائیت کو ایک مسئلہ عورت کا استحصال بحیثیت "بہو" کی صورت میں بھی ہے۔ عورت کا روپ ماں، بہن، اور بیٹی کا بھی ہے۔ جب عورت ان رشتوں میں بندھی ہوتی ہے تو ہمارے سماج کا رویہ اس کے ساتھ اچھا ہوتا ہے۔ لیکن جب عورت شادی کے بعد بہو کا درجہ حاصل کرتی ہے تو سماج کا رویہ اور سلوک قدرے مختلف ہو جاتا ہے۔اس کے ساتھ اس طرح کا رویہ اور سلوک نہیں رکھا جاتا اور نہ ہی اس کے جذبات کی قدر کی جاتی ہے اور نہ بہو کے ساتھ اخلاقی برتاؤ اچھا رکھا جاتا ہے۔اس کے حقوق کا اس طرح خیال نہیں کیا جاتا جس طرح ماں باپ کے گھر میں اس کے ساتھ معاملات کیے جاتے ہیں۔

اس افسانے کا مرکزی دار "بہو" کا ہے۔ روایتی سماج کے اندر بہو کا یہ تصور ہے کہ اس کا کام صرف

ناشتہ بنانا، آٹا گوندھنا، گھر کے کام کاج اور شوہر کے ساتھ گھر کے تمام افراد کی خدمت کرنا بھی ہے۔ بہو کو صرف گھر تک محدود رکھا ہے اور اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ گھر کے تمام کام کرنے کے باوجود بھی ٹوکا جاتا ہے۔ اس کے کام اور ذمہ داریوں کی تعریف کے بجائے اس پر بے جا تنقید کی جاتی ہے۔ جس سے وہ ذہنی کرب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

ماں، بہن، بیٹی اور بیوی، بہو عورت کا ہر روپ، ہر کردار خوبصورت ہوتا ہے۔ کہیں قربانیوں میں جکڑی ہوتی ہے، کہیں محبتوں میں، کہیں الفت و محبت اور غمگسار کی جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہے۔ لیکن بحیثیت بہو، عورت امتیازی سلوک اور جبر و استحصال کا شکار ہے۔

خالدہ حسین نے اپنے افسانے "دہان زخم" میں بھی روایتی معاشرے میں عورت کا استحصال بحیثیت بہو کی عکاسی کی ہے کہ آج کے دور میں عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا ہے۔ اس کو گھر میں کسی قسم کا اختیار نہیں دیا جاتا ہے۔ بلکہ بہو کو گھر میں ایک شے سمجھا جاتا ہے۔ اس کو گھر میں کسی امور میں کوئی اختیار نہیں دیا جاتا۔

> "مگر آج تکیے پر جانے کی بجائے وہ پہلے تندور پر روک گئی۔ جنتے کی بہو ہرے دوپٹے کی بکل مارے پیڑے کر رہی تھی اور اس کا سرخ چہرہ تندور کی طرح دمک رہا تھا۔ ناک اور اوپر کے ہونٹ کے درمیان موتیوں ایسے پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ آج گداز بانہوں میں ہری اور سرخ چوڑیاں پھنسی تھیں۔۔۔ جنتے کی بہو نے اپنے حنائی ہاتھوں سے سومزہی روٹی دستر خوان میں لپیٹ کر اس کے سامنے رکھ دی۔"(۱۴)

خالدہ حسین نے روایتی سماج میں ایسی عورتوں کی نشاندہی کی ہے۔ جنہیں بہو بنتے ہی کام پر لگا دیا جاتا ہے حالانکہ ان کے ہاتھوں سے ابھی مہندی کا رنگ بھی نہیں اترا ہوتا مگر شادی کے بعد ہر طرح کی بے جا ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر ڈال دی جاتی ہیں۔ خود کو لوگ ان ذمہ داریوں سے الگ کر کے پر سکون ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

"خالدہ حسین کے افسانوں کا بنیادی موضوع طرز احساس ہے۔ خالدہ حسین کے ہاں خوف، نفرت، اذیت اور تشکیک سے اٹھاتے ہیں۔۔۔ خالدہ حسین کے بیشتر افسانوں کا منظر نامہ درمیانے درجے کے گھریلو ماحول سے ترتیب پاتا ہے۔"(۱۵)

روایتی سماج کے حوالے سے دیکھا جائے تو دیہی معاشرے کے اندر بے اولاد عورتوں کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اولاد نہ ہونے کی ذمہ داری صرف عورت پر عائد کر دی جاتی ہے۔ قصور وار صرف عورت کو سمجھا جاتا ہے اور بعض اوقات عورتیں اپنا گھر بچانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتی ہیں۔ اسی حوالے سے خالدہ حسین کا افسانہ "جھاڑو" ایک شاہکار افسانہ ہے جس میں خالدہ حسین نے روایتی معاشرے کے اندر اولاد کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار جس کی شادی تو ہو جاتی ہے مگر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اس کا اپنے گھر میں رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار اپنے گھر کو بچانے کے لیے جھوٹ موٹ ماں بننے کا ناٹک کرتی ہے۔

"سچ کہنا اماں۔ یہ سب کس کا دوش ہے ہم نے تو مجبوراً جھوٹ بولا ہے۔ ورنہ آج ہم بھی بندی خانے میں زنجیروں سے بندھے ہوتے"(۱۶)

روایتی سماج کے حوالے سے دیکھا جائے تو دیہی معاشرے میں عورتیں اپنا گھر بچانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتی ہیں۔ اس افسانے کی مرکزی کردار بھی شوہر سے جھوٹ بولتی ہے کہ وہ ماں تو بننے والی ہے لیکن اولاد ہونے تک پیر و مرشد نے آپ سے دور رہنے کا حکم دیا ہے۔ اس افسانے کی مرکزی کردار اپنا گھر بچانے کی خاطر اتنی مجبور اور بے بس ہوتی ہے کہ ساری زندگی جھوٹ، خوف اور ڈر کے ساتھ بسر کرتی ہے۔

"ادھر محل میں کمسن رانی دن رات مارے خوف کے تھر تھر کانپا کرتی ہے۔ اے اماں یہ تو نے کیا کیا۔ وہ بادشاہ ہے۔ کسی بھی وقت زبردستی آن گھسے گا۔(۱۷)

دیہی معاشرے میں ایک اہم مسئلہ بیٹیوں کی شادی کا بھی ہے۔ جس کی طرف خالدہ حسین نے اپنے افسانے "جو کچھ جیسا ہے، جہاں ہے" میں اس مسئلے کی عکاسی کی ہے کہ دیہی معاشرے کے اندر بیٹیوں کے لیے بر

وقت ایک اچھا رشتہ ملنا ایک مشکل امر ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار جو ساری زندگی ایک خستہ گھر میں بسر کر دیتی ہے لیکن گھر کے خستہ ہونے کی وجہ سے اس کی بیٹیوں کے لیے رشتے نہیں آرہے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنا گھر باہر چھوڑ کر کہیں اور جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔

"بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو وقت پر اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔۔۔اور اب ہمیں بھی بیٹیوں کی شادی کے لیے ہمیں ایک پوش علاقے میں نقل مکانی کرنا ہو گی۔[۱۸]

روایتی سماج کے حوالے سے دیکھا جائے تو دیہاتوں کے اندر زندہ انسانیت کی بے قدری اور تذلیل کی جاتی ہے۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانے "چوبارہ" میں ایک ایسے سماج کی عکاسی کی ہے جس میں ایک عورت اپنے شوہر کی خاطر چوبارے میں گزارہ کرنے پر مجبور ہوتی ہے اور بیٹے کی خاطر جس کو پڑھنے کے لیے باہر بیج دیتی ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار نے بہت سخت زندگی گزاری اور اس مشکل ماحول کو اپنے گھر والوں کے لیے برداشت کرتی ہے تاکہ ان کو راحت اور سکون ملے۔ لیکن جب وہ عورت خود بیمار ہوتی ہے تو کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ ہر کوئی اپنی دنیا میں مگن تھا۔ وہ بیماری میں تڑپتی رہی لیکن کسی نے اس کی تیمارداری تو دور کی بات اس کو پوچھنا تک گوارا نہیں کیا۔ اس کی صحت دن بدن بگڑنے لگی اور اسی عالم میں اس نے دنیا کو خیر آباد کہہ دیا۔ جب اس کے اکلوتے بیٹے کو پتا چلا تو وہ اس وقت گھر پہنچا جب ماں کا انتقال ہو چکا تھا اور بیٹا ہی بوا جی کو چوبارے سے ترچھا اٹھا کر نیچے لے آتا ہے۔

"اب انتظار تھا کہ لاہور سے بوا جی کے اکلوتے بیٹے آئیں جنہیں سب بڑے بھائی صاحب کہتے ہیں۔۔۔بڑے بھائی صاحب نے انھیں بانہوں میں اٹھایا اور بوا جی لکڑی کی سی چیز بن چکی تھی۔ لکڑی جس کو بڑے بھائی سب نے اکیلے ہی اٹھا کر نیچے گہرے صحن میں جنگلے والے پلنگ میں ڈال دیا"[۱۹]

ارد گرد کے تمام لوگ قرآن پاک پڑھنے اور رونے دھونے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ لیکن کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ بوا جی کے منہ سے لحاف اٹھا کر ایک بار اسے دیکھ سکیں۔

"وہ زینہ چل کر اوپر پہنچتی ہے بوا جی پر پڑے لحاف کو دیکھتی ہے۔ اس کا دل تھم جاتا ہے۔۔۔ مگر کوئی بھی لحاف اٹھا کر نہیں دیکھتا۔۔ سب کے سب قرآن پڑھنے اور رونے میں مصروف ہیں۔ بیٹھک میں نیلی دری بچھ گئی ہے۔ میاں جی کمبل میں بیٹھے ہیں کھا گئے کھا گئے۔"(۲۰)

خالدہ حسین روایتی سماج کے ملاپ سے افسانہ بُنتی ہیں۔ جس سے قاری پڑھنے کے بعد قاری غور و فکر کی طرف مائل ہو جاتے ہیں افسانہ میں "بوا جی" کے کردار کے ذریعے ایک ایسی عورت کی عکاسی کی گئی ہے جو ساری زندگی اپنے بچوں اور شوہر کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ مگر اسے مرنا بھی سکون سے نصیب نہیں ہوتا ہے ایک بے جان شے کی طرح پوری زندگی چوبارے میں گزار دیتی ہے۔ اسے صلے میں کچھ بھی نہیں دیا جاتا ہے۔ خالدہ حسین انسانی نفسیات کی رمز شناسی اور شعور کی بازیافت سے انسانی ذات کے حوالے سے عرفان حاصل کرتی ہے۔ خالدہ حسین کے افسانوں کی عورت احساس شکست اور بے بسی سے دوچار نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صباحت مشتاق لکھتی ہیں:

"اسلوب، موضوع اور تکنیک کے حوالے سے خالدہ حسین نے ایک نئی راہ دریافت کی ہے۔ جس سے ان کے ہم عصر بھی کسی حد تک متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کی تہہ دار کہانیوں میں ایک سطح تو عام طور پر سیدھی سادی کہانی کے طور پر نظر آتی ہے۔ جب کہ دوسری سطح جو ایک خاص نقطہ نظر کی حامل ہوتی ہے۔ وہ قاری کو غور فکر پر مجبور کرتی ہے ۔۔۔ ان کے افسانوں میں واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے واقعات اور کرداروں کے خارجی عمل کے مقابلے میں ان کی نفسی کیفیات کو زیادہ اہمیت دی ہے۔"(۲۱)

(ج) روایتی سماج میں عورت اور مرد کا رشتہ اور عائلی مسائل:

خالدہ حسین کے افسانوں میں موجود عورت خارجیت سے زیادہ باطنیت پرست نظر آتی ہے جو اپنی اندر کی دنیا سے واقف رہنا چاہتی ہے۔ اس عورت میں عقل و شعور کا ادارک ہونے کے ساتھ ساتھ ذات سے

آگاہی موجود ہے لیکن روایتی معاشرے کے اندر مرد اور عورتوں کو عائلی زندگی میں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان سمجھوتہ نہ ہونے کی وجہ سے اکثر نوبت طلاق کی آجاتی ہے۔ عائلی زندگی کے مسائل کی عکاسی خالدہ حسین نے اپنے افسانوں "الاؤ"، "والعصر"، "یار من بیاہ" اور "ڈولی" میں کی ہے۔ روایتی معاشرے کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہمارے سماج کے اندر طلاق شدہ عورتوں کا وجود نا قابل قبول سمجھا جاتا ہے۔ افسانہ "الاؤ" کا مرکزی کردار "سلیمہ" کا ہے جس کو اس کا شوہر چھوڑ دیتا ہے۔ تو اس کو اپنی زندگی بھی بے مقصد نظر آتی ہے۔ آج کے دور میں بھی ہمارے روایتی معاشرے کے اندر طلاق شدہ عورت کی آرائش و زیبائش کرنا غلط تصور کیا جاتا ہے۔ شوہر کے بغیر عورت کا کھل کر جینا، ہنسنا اور کھیلنا کسی بھی میدان میں آگے بڑھنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ خالدہ حسین نے "سلیمہ" کے کردار کے ذریعے روایتی معاشرے پر روشنی ڈالی ہے کہ آج کے جدید دور کے اندر بھی ہماری روایتی سماج کی عورتیں شوہر کے چھوڑ جانے کے بعد خود کو دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہیں۔

> "بھائی تم لوگ کیسے مزے سے بیٹھی باتیں بنا رہی ہو۔ اس لیے کہ تمہارا گھر ہے۔ شوہر ہے۔ گھر ہے۔ بچے ہیں تمہارے پاس زندگی کا اتنا ٹھوس اتنا بڑا مقصد ہے۔ مگر مجھے دیکھو مجھے اپنی تمام خوبصورتی کے باوجود ایک تنہا اجاڑ کمرے میں تصویروں کے درمیان وقت گزارنا ہے کہ وقت کو مارنا ہے زندگی کو مارنا ہے۔ قتل کرنا ہے۔ سلیمہ نے یک دم غصے میں آکر ہینڈ بیگ بند کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔"(۲۲)

روایتی معاشرے کے اندر عورتیں اپنی زندگی کا مکمل وجود مرد کے ساتھ ہی سمجھتی ہیں۔ اگر کوئی عورت شوہر سے علیحدہ ہو جائے تو اس کے وجود اور ذات کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ بے شک مرد ظلم و ستم کا نشانہ بنائے لیکن روایتی معاشرے کے اندر عورتیں تمام ظلم و ستم اس لیے برداشت کر لیتی ہے کہ مرد کے بغیر اپنا وجود بے کار سمجھتی ہیں۔ فرد کی آزادی کی خواہش، تقدیر، جبریت اور وجود کی مماثلت جیسے موضوعات اس افسانے میں ملتے ہیں۔ یہ کہانی خالدہ حسین کے وجود سے ذاتی تجربے کے نتیجے میں آتی ہے۔ جیسے دنیا میں اپنی جگہ بنانے اور اپنی شناخت کا بیان ہے۔ روایتی سماج کے اندر عورت کا وجود صرف مرد کے ساتھ ہی مکمل سمجھا

جاتا ہے۔ مرد کے ساتھ کے بغیر عورت اپنے وجود کو ناقص سمجھتی ہے شوہر کے چھوڑ جانے کے بعد اپنے آپ کو صرف بند کمرے میں قید کر لیتی ہیں۔

روایتی سماج کے اندر اگر کوئی عورت ذہین ہے تو معاشرہ اس کی ذہانت کے جراثیم کے خاتمے کے لیے کم عمری میں ہی اس کی شادی کروا دیتا ہے تا کہ وہ بچے پیدا کر کے اپنی تخلیق کا اصل مقصد پورا کر سکے۔ روایتی سماج کے اندر مردانہ سوچ ہے کہ اگر کوئی عورت ذہین ہے تو اس کا مقصد صرف بچہ پیدا کرنا ہے۔

> "ہاں اس معاشرے سے سمجھداری ذی معاشرے ہوش عورت کے خاتمے کی یعنی کہ جب کسی بچی میں ذہانت کے اسے الٹے سیدھے جراثیم دیکھیں۔ بہ سن بلوغت اس کی شادی کر دی تا کہ وہ صیح وقت پر تندرست بچے پیدا کر سکے۔ کائنات میں اپنی تخلیق کا مقصد پورا کرے اور زندگی خوبصورت غرارہ پہن کر میلاد و شریف کی محفلیں سجائے۔"(۲۳)

روایتی سماج کے اندر اگر کوئی عورت ذہین اور صلاحیت مند ہے تو اس کی صلاحیتوں کو اجاگر نے کے بجائے اس کو صلاحیتوں کو دبا دیا جاتا ہے۔ روایتی معاشرے کے اندر عورتوں کی تخلیق کا مقصد صرف بچوں کی پیدائش سمجھا جاتا ہے۔ میلاد کی محفلوں کی ذمہ داری ایسی ذہین عورتوں کو سونپ دی جاتی ہے۔

"الاو" افسانے میں عورت وجود کے احساس اور دریافت کی متلاشی نظر آتی ہے۔ ہمارے روایتی سماج کے اندر آج بھی عورت کی تخلیق کا مقصد صرف بچے پیدا کرنا ہی سمجھا جاتا ہے۔ صرف خوبصورت کپڑے پہننا اور میلاد شریف کی محفلیں سجانا ہی دیہاتوں کا مقصد ہوتا ہے۔ کم عمری میں شادی کرنا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔

پاکستان کے دیہی معاشرے میں کم عمری میں شادی کا رواج عام ہے۔ کسی بھی بچی کی زبردستی شادی کم عمری میں کر دی جاتی ہے۔ اسے عمر بھر اس کے نتائج بھگتنا پڑتے ہیں جس کی وجہ سے تعلیم بھی مکمل نہیں ہو پاتی۔ دوران حمل پیچیدگیوں اور شوہر کی طرف سے زیادتی کے امکانات بھی بہت بڑھ جاتے ہیں۔ دیہی خواتین بھی اپنی بچیوں کی کی شادی کے لیے منتیں مانگنے کا کام بھی کرتی ہیں۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانے "الاو" میں

عورتوں کے استحصال کو موضوع بنایا ہے۔

"زندہ باد رفعت اس کو مسکراتا دیکھ کر خوش ہوگئی۔ بھائی بات یہ ہے کہ میری دو بیٹاں ہیں۔ ان کو سولہ سال لگنے سے پہلے ہی نہ بیاہ دیا تو نام نہیں۔ اس کے لیے میں نے تو منت بھی مان لی ہے۔ ہائے۔ تم اور منت؟ رابعہ خوفزدہ ہوگئی۔ ارے ہاں۔ تو کیا حرج ہے۔ بھائی منت ماننے میں ایسا کون سا نقصان ہے۔ اگر پوری ہوگئی تو ویل اینڈ گڈ نہ ہو تو پرواہ نہیں سووٹ"(۲۴)

دیہی معاشرے میں لڑکی جب پیدا ہوتی ہے تو دیگر معاملات کو بالا طاق رکھ کر اس کی جلد از جلد شادی کر کے اس کا گھر بسانا والدین کی اولین ترجیح ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ لڑکی کی پیدائش سے ہی فکر مند دکھائی دیتے ہیں۔ منتیں مانگنا اور دیگر ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ دیہی معاشرے کے اندر عورتوں کی تخلیق کا مقصد ہی شادی اور بچوں کی پیدائش ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کسی بھی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لایا جاتا ہے۔

خالدہ حسین کے افسانوں میں عورت کے مسائل، اسلوب ایک نئے انداز سے سامنے آتے ہیں۔ دیگر کرداروں کی طرح خالدہ حسین کے افسانوں کی عورت کم مائیگی اور احساس شکست اور خوف سے دوچار ہے۔ تعلیم پر انسان کا بنیادی حق ہے۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔ لیکن سماج عورت کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ روایتی سماج کے اندر عورت کا پڑھنا لکھنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ کسی بھی معاشرے کے اندر تعلیم نسواں انتہائی اہم ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر معاشرے میں مثبت اور تعمیری روائیوں کا تصور محال ہے۔ لیکن روایتی سماج خواتین کی تعلیم و ترقی کے حق میں نہیں ہے۔ حالانکہ معاشرے کے اندر مرد اور عورت دونوں کا اہم حصّہ ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک توازن بگاڑ سکتی ہے۔ اس کی عکاسی خالدہ حسین نے افسانے "والعصر" میں کی ہے۔

افسانے کی مرکزی کردار "بنٹی" کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ چھپ کر کتابیں خرید خرید کر پڑھتی ہے۔ کتابیں پڑھ کر سوچ بچار اور غور و فکر کرنے کا حق روایتی سماج کے اندر عورتوں کو ہر گز نہیں دیا جاتا۔ "بنٹی" جو ایک نہایت ذہین اور قابل فہم لڑکی ہے۔ وہ کتابیں پڑھ کر معاشرے کے

ارد گرد ماحول پر گہری نظر رکھتی ہے۔ لیکن جب اس کی ماں اس کی شادی کرواتی ہے تو اس کو نصحیت کرتی ہے کہ جو کچھ تم نے پڑھا یا محسوس کیا تم سب یہاں بھلا کر جاؤ گئی۔ کتابیں پڑھنا تمہارا شوق تھا اور تم اس شوق کو اسی گھر میں دفن کر کے جاؤ گئی۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانے "والعصر" میں ایسی عورت کی عکاسی ہیں جس کو پڑھنے کا بہت شوق ہوتا ہے لیکن معاشرے کے ڈر کی وجہ سے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیتی ہے اور اس کی صلاحیتوں کو دبا دیا جاتا ہے۔

> "بنٹی تمہارا گھر بہت خوبصورت ہو گا۔ ساجد ایک کامیاب انسان ہے۔ کبھی خسارے کا سودا نہیں کیا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ مجھے معلوم تھا۔ وہ میرا دل رکھ رہی ہے۔ پھر اس نے بالکل غیر متوقع طور پر کیا۔ میری سب کتابیں الماری میں بند ہیں۔ یہ چابی ہے میں نے خاموشی سے چابی پکڑ لی۔ پھر میں نے اس سے کہا۔ مجھ سے وعدہ کرو تم کبھی ساجد سے کتاب کی بات نہیں کرو گئی۔ اس نے ایک زخمی نگاہ مجھ پر ڈالی اور اسے کبھی نہیں بتاؤ گئی تم نے کیا پڑا، کیا سوچا اور کیا محسوس کیا تھا۔ اپنی پچھلی زندگی میں۔ اور کون کون تمہیں عزیز ہے۔ اور کس کس کو تم عزیز ہو"(۲۵)

روایتی معاشرے میں دیہاتوں کے اندر خواتین کی صلاحیتوں کو دبایا جاتا ہے۔ خواتین کا تعلیم حاصل کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی عورت تعلیم حاصل بھی کر جائے تو اسے زندگی بھر اس تعلیم کا طعنہ دیا جاتا ہے اور اس پر روایت کی خلاف ورزی کا الزام لگا کر اس کو زندگی بھر ستایا جاتا ہے۔ اول تو دیہی خواتین کا تعلیم حاصل کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی تعلیم حاصل کر بھی لے تو معاشرے سے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ اسی کی عکاسی خالدہ حسین نے اپنے افسانے کے اندر کی ہے۔ دیہی خواتین مجبور ہو کر تعلیم سے محروم ہو جاتی ہیں۔

جدائی، ہجر اور فراق عورت کی احساس ہے۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانے "والعصر" کے ذریعے یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ عورت کو زندگی کے ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی جدائی برداشت کرنا پڑتی ہے۔ کبھی کسی ذات سے الگ سے ہونا پڑتا ہے، کبھی اپنے خوابوں کو چکنا چوڑ کرنا پڑتا ہے اور کبھی اپنے خیال و تصور کو رد

کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ عورت اپنے ارد گرد ایک بہت خوبصورت دنیا بنانا جانتی ہے لیکن ہمارا معاشرہ عورت کو ان تمام حقوق سے محروم کر دیتا ہے۔ ایک عورت کو ہر حال میں اس کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔

"مگر وہ تو مجھے کبھی عورت نہیں آئی تھی۔ وہ تو پارے کی طرح متحرک ذہانت تھی۔ جو چھوٹی چھوٹی چیزوں اور معمولی کاموں سے اپنے اعتراف ایک خوبصورت دنیا تخلیق کرنے کا ہنر جانتی تھی۔ جس سے سچ اور محبت کی خوشبو آتی تھی۔ میں نے اسے کبھی نہیں بتایا تھا۔ کہ جدائی، ہجر و فراق کی احساس ہے۔ وہ زندگی کی ہر ساعت کوئی نہ کوئی جدائی برداشت کرتی ہے۔ کسی ہستی، خیال تصور، خواب کی "(۲۶)

خالدہ حسین عورت کی ذات کے حوالے سے سوال اٹھاتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ اقدار و روایات نے عورت کی ذات کو اصل منصب سے بھی محروم کر دیا ہے۔ عورت کو مطمئن کروایا جاتا ہے کہ اس مشینی دور میں بھی عورت اپنے فرائض منصبی کا برہم رکھے۔ اقدار و روایات اور نظام عورت کی ذات اور ارتقاء کے راستے میں حائل ہے۔ اس افسانے کی مرکزی کراد جو ذہین تھی اور جو اپنی ذہانت سے ایک خوبصورت دنیا تخلیق کر لیتی تھی لیکن روایتی معاشرہ عورت کی ذہانت کو قید کر کے اس کو جدائی اور ہجر جسے المیہ سے دوچار کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر حمیرا اشفاق لکھتی ہیں:

"خالدہ حسین نے متوسط طبقے کی خواتین اوران کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ ان کہانیوں کے کرداروں کے ذریعے پڑھے لکھے اور ان پڑھ افراد کے مابین تفاوت کو منعکس کیا گیا ہے۔ جو ایک دوسرے کے ساتھ جبرَجوڑ دیے جاتے ہیں ان کی زندگی بالخصوص عورت کی زندگی کو معاشرے کے استحصالی روائیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ معاشرہ جسم کے داغوں کو دیکھ سکتا ہے روح کے داغوں کو نہیں "(۲۷)

شادی پوری عمر کا ساتھ ہوتا ہے۔ اس ساتھ میں لڑکے اور لڑکی کی ذہنی ہم آہنگی کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زندگی کا سفر محال ہو جاتا ہے۔ اسی موضوع کو احاطہ تحریر میں لاتے ہوئے خالدہ حسین نے اپنے افسانے "یار من بیاہ" میں روایتی سماج کے اندر بغیر مرضی اور بے جوڑ شادی کی طرف توجہ

دلائی ہے۔ روایتی سماج کے اندر شادی کے معاملات والدین کی مرضی سے طے پاتے ہیں جو بعد میں اکثر ناچاکی اور بے سکونی کا باعث بنتے ہیں۔ اس افسانے کا مرکزی کردار "امتل" کا ہے۔ جس طرح روایتی معاشرے میں لڑکیوں کو شادی کے بعد میکے جانے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی اسی طرح افسانے کی مرکزی کردار "امتل" کو شادی کے بعد ماں باپ سے ملنے بھی نہیں دیا جاتا۔ اگر عرصہ بعد وہ چلی بھی جائے تو اسے مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی اکثر نگرانی کی جاتی ہے۔ روایتی معاشرے کے اندر عورتوں کے ساتھ شادی کے بعد ایسا سلوک کیا جاتا ہے کہ جیسے انھیں بیاہ کر نہیں بلکہ خرید کر لایا گیا ہو اور میکے والوں سے ملنے کے لیے اسے گھر والوں کی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔

افسانے کی مرکزی کردار "امتل" جو شادی کے بعد میکے جاتی ہے تو ساس اس شرط پر اسے واپس لے کے آتی ہے کہ وہ دوبارہ لال حویلی کا رخ نہیں کرے گئی اور نہ ہی دوبارہ میکے جانے کی ضد کرے گی۔

> "یہ نام لعل کوٹھی کبھی اس نے امتل کی زبانی سنا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی ساس اسے واپس گھر لے جانے پر اس شرط پر راضی ہوئی تھی کہ وہ کبھی لعل کوٹھی نہ جائے گئی۔ نہ ہی وہاں جانے کی ضد کرے گی۔ اس کے شوہر نے بھی گلے کی گلیں پھیلا پھیلا کر اور چھوٹی چھوٹی انکھیں نکال گھوما کر یہی کہا تھا کہ اگر کبھی لعل کوٹھی کا ذکر اس کی زبان پر آیا تو وہ چھری سے اس کی زبان کاٹ ڈالے گا۔"(۲۸)

روایتی معاشرے کے اندر مرد ہمیشہ عورت کو غلام بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ شادی کے بعد وہ سمجھتا ہے کہ عورت اس کی غلام بن گئی ہے۔ وہ عورت نہیں بلکہ اس کی حیثیت ایک شے کی ہے۔ مرد کی مرضی کے بغیر وہ سانس تک نہیں لے سکتی۔ وہ عورت کو دبا کر رکھنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ عورت اس کا نام سن کر خوف زدہ ہو جائے۔ شادی کے بعد اس کے ماں باپ سے کب اور کس وقت ملنا ہے اس کا فیصلہ بھی مرد کی اجازت سے مشروط ہوتا ہے۔

" اسی وقت دھاڑے سے دروازہ کھلا اور وہ کالا مضبوط جسم ،سفید کپڑے ۔۔۔ کیا
بکواس کر رہی ہے کمینی پھر وہ ہی بانیاں بول رہی ہے۔ اپنی عربی، فارسی اچھا اچھا ابھی
پوچھتا ہوں۔ تیری زبان میں۔ ابھی خبر لیتا ہوں۔ "(۲۹)

روایتی معاشرے کے اندر عورتوں کے ساتھ بھیڑ بکریوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ مار پیٹ اور گالم گلوچ کو مرد اپنی شان سمجھتا ہے اور عورتوں کو جانوروں کی طرح مارا پیٹا جاتا ہے اور ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ تمام ناانصافیوں کے باوجود بھی معاشرے کی نیک پروین سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ مرد کے ہر رویے کو خوشی خوشی اور خوش اسلوبی سے برداشت کرے۔ اسی افسانے کی مرکزی کردار "امتل" جس کو شوہر جانوروں کی طرح مارنا پیٹتا ہے مگر اسے یہ تمام ظلم خاموشی سے برداشت کرنا پڑتے ہیں۔

شادی سے پہلے جب لڑکی کی پسند نہ پوچھی جائے تو بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ خالدہ حسین نے اپنے اس افسانے "یار من بیاہ" میں "ام کلثوم" کے کردار کے ذریعے توکل کی بنا پر کی جانے والی شادیوں کی عکاسی کی ہے۔ روایتی معاشرے کے اندر لڑکیوں کی شادی توکل کی بنا پر کر دی جاتی ہے جس کی وجہ سے ساری زندگی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ رضائے الٰہی کا تصور مان کر نیک اور شریف لڑکی کی شادی اس بنا پر کر دی جاتی ہے کہ یہی رضائے الٰہیٰ ہے۔ ہمارے روایتی سماج کے اندر آج بھی توکل اور رضائے الٰہی کا تصور موجود ہے۔ اس کو ہی قسمت تصور کر لیا جاتا ہے۔ توکل کی بنا پر کیے جانے والے رشتے بعد میں نہ چاکی کا باعث بنتے ہیں۔

خالدہ حسین نے "ام کلثوم" کے ذریعے روایتی سماج میں نسائیت کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ ہمارے روایتی سماج کے اندر لڑکے اور لڑکی کا اختیار شادی کے معاملات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پسند اور نہ پسند کی بات تو بہت دور کی ہے۔ "ام کلثوم" جس کا تعلق رئیس خاندان سے تھا۔ وہ روحانی علوم میں کمال رکھنے والی لڑکی تھی۔ "ام کلثوم" کا باپ ایک بہت بڑا پیر تھا جس کے آستانے پر بہت سارے لوگ حاضری لگوانے کے لیے آتے تھے۔ ایک دفعہ ایک مرید اپنا رشتہ لے کر پیر صاحب کے پاس آتا ہے تو پیر یہ کہہ کر ہاں کر دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا ہے۔ حالانکہ بہت سارے لوگوں نے ان کو روکا بھی۔ تاہم کسی کی بھی بات

انھوں نے نہیں سنی۔

"ام کلثوم ان کے دور پار کے ماموں کی اکلوتی اولاد تھی۔ اور ماموں کا شمار شہر کے رئیسوں میں ہوتا ہے۔ نہ صرف رئیس بلکہ وہ اپنے روحانی مدارج اور کمالات سے مرجع خلائق تھے۔ دور دراز کے لوگ ان کے آستانے پر حاضری دیتے تھے۔ مگر توکل بھی ایک عجیب تصور اور مرحلہ ہے۔ سلیمہ بیٹی۔ اماں نے کہا تھا۔ معلوم نہیں اس کا مطلب کیا ہے۔ ہماری سمجھ سے بالاتر ہی ہے۔ مگر ماموں سے ان کے مرید نے بیٹے کے لیے کلثوم کا رشتہ مانگا تو رضائے الٰہی کہہ کر مان گئے۔ جب لوگوں نے روکا تو کہا اس کی رضا یہی ہے۔ ہم تم روکنے والے کون ہیں۔ اگر یہ مٹی ہے تو اس کے حکم سے سونا ہو جائے گا اور اگر نہیں تو پھر سونا بھی مٹی ہو سکتا ہے۔"(۳۰)

خالدہ حسین نے "ام کلثوم" کے ذریعے روایتی معاشرے کی عکاسی کی ہے۔ توکل اور رضائے الٰہی کی بنا پر کر دینے والی شادیاں اکثر ناچاکی کا باعث بنتی ہیں۔ خالدہ حسین کے مطابق اس طرح کے مسائل کے ذمہ دار پورے گھر والے ہوتے ہیں۔ توکل اور اللہ کی رضا کی بنا پر شادی تو کر دی جاتی ہے لیکن اس کے بعد کے تمام مسائل عورت کو ہی برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ "ام کلثوم" کو "غفور" صرف بچے پیدا کرنے والی مشین سمجھتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد "ام کلثوم" کی حالت بہت ہی نازک ہو جاتی ہیں۔ لیکن "غفور" اس کو کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں دیتا۔ ایک دفعہ "ام کلثوم" نے پراٹھا کھالیا تو اس کے شوہر نے اس کو مارا پیٹا کہ گھی کا ڈبہ کیوں آدھا ہو گیا ہے۔

"اپنی عربی فارسی اچھا اچھا ابھی پوچھتا ہوں۔ تیری زبان میں ابھی خبر لیتا ہوں۔ تیرا گھی کا ڈبہ اتنا نیچے کیسے ہو گیا؟ ہیں۔۔۔ دس دن سے کچھ نہیں کھایا۔ کپڑوں کا ڈھیر پڑا ہے۔ دھلنے والا ہوں۔ پراٹھا اور یہ امتل پچھل پری کون ہوتی ہے۔"(۳۱)

روایتی سماج کے اندر مرد ہمیشہ حکمران سمجھتے ہوئے عورت کو غلام رکھنا چاہتا ہے۔ عورت کی ذہنی اور نفسیاتی صورتحال کو سمجھنے کے بجائے اس کے جذبات کا قتل کر دیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان کے دیہی معاشرے میں عورت گونا گو مسائل سے دوچار ہے۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانے میں "امتل" کے کردار

کے ذریعے ایک ایسی عورت کی عکاسی کی ہے۔ جس کو شادی کے بعد صرف بچے پیدا کرنے والی مشین سمجھ لیا جاتا ہے۔ بچے کی پیدائش پر کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں دیا جاتا ہے۔ شادی اور دیگر معاملات زندگی میں نہ ہی اس سے رائے لی جاتی ہے اور نہ ہی اس کو کوئی اہمیت دی جاتی ہے۔ اگر کوئی عورت اپنی حدود و قیود کو پھلانگنا چاہے تو وہ باغی ٹھہرائی جاتی ہے۔ آج بھی اپنے وجود کا جواز چادر اور چار دیواری میں ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ خالدہ حسین لکھتی ہیں۔

> "عورت کی ایک اپنی دنیا بھی ہے۔ انسان کے عمومی مسائل کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے مسائل بھی ہیں۔ جو صرف وہی جانتی، ہستی، خون میں رچاتی اور ان کے فنی اظہار کے لیے مضطرب رہتی ہے۔ نسائی حیثیت کوئی فارمولا نہیں ہے کہ سامنے رکھ کر وہ ادب تخلیق کر دے۔ یہ تو اس کی زندگی کے منفرد تجربے اور طرز احساس ہی کا نام ہے۔"(۳۲)

روایتی معاشرے میں عورت کو بے رحمانہ اور ظالمانہ انداز میں مارا پیٹا جاتا ہے۔ ان تمام کے باوجود بھی دیہی معاشرے کی خواتین اپنے شوہر کا بھرم رکھتی ہیں۔ بعض اوقات مجبوری کے طور پر اور بعض اوقات طلاق کے ڈر سے احتجاج نہیں کرتی۔ خالدہ حسین نے عورت کی زندگی میں سمجھوتے کے اس رخ کو "ام کلثوم" کے ذریعے پیش کیا ہے۔ "ام کلثوم" اپنی تمام تر صورتحال کی ذمہ داری اپنے ابا پر عائد کرتی ہے کہ وہ خدا اور رسول کے مطابق اس کے ساتھ صلہ رحمی کرنے میں قطعی ناکام ہوئے تھے۔ "ام کلثوم" یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ لوگ سو برس سے اوپر نہیں جیا کرتے۔ اسے رضائے الٰہی کی دار پر چڑھانے والے کی عمر تو اب سو اصدی ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش لکھتی ہیں:

> "عورت ہر معاملے میں زیادہ مجبور، بے بس اور پایہ زنجیر ہوتی ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کے سماج، گھر رشتوں حتیٰ کی وجود تک کی تشکیل مرد کے ساختہ قواعد وضوابط، مرد کی عائد کردہ پابندیوں اور قدغوں اور مرد کے مدون کردہ قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ عورت کے انفرادی وجود کی احساس اس کی شخصیت کی نمو اور

ذات کی متنوع جات کے فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کے بجائے اسے ایسے سانچے
میں ڈھالا جاتا ہے یا اس سے ایسے سانچے میں ڈھلنے کی توقع کی جاتی ہے جو ہر لحاظ سے
مرد کے لیے سود مند ہوتا ہے۔"(۳۳)

دیہی معاشرے کے اندر دیہات میں بے جوڑ شادی کر کے سر سے بوجھ اتارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ شادی پوری عمر کا ساتھ ہوتا ہے۔ لڑکی اور لڑکے کی ذہنی ہم آہنگی کا ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن آج بھی روایتی معاشرے کے اندر شادی کے معاملات لڑکی کی رضامندی کے بغیر طے کر دیئے جاتے ہیں۔ لڑکی کی رائے لینا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ افسانہ "ڈولی" میں خالدہ حسین نے جنازے اور ڈولی میں پائے جانے والے اشتراک کو موضوع بنایا ہے۔ بغیر مرضی کی شادی عورت کے وجود اور شخصیت کا اختتام ہے۔ شادی اگر مرضی پسند کے نتیجے میں بھی ہو تب بھی اس کے وجود کا خاتمہ ہی ہوتا ہے۔ افسانہ "ڈولی" میں افسانے کی مرکزی کردار ایک ایسی عورت ہے کہ جب اس کی ڈولی کا وقت آتا ہے تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو اس میں سوار ہونا پڑتا ہے۔ شادی کے دن افسانے کی مرکزی کردار کو جب اس کی سہیلی چوڑیاں پہنا رہی ہوتیں ہیں تو وہ کہتی ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

"میں جانتی ہوں پہلی چوڑی چڑھاتے ہوئے اس نے سرگوشی کی۔ میں جانتی ہوں مگر
اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس نے چاروں طرف پھیلے پر تکلف انتظامات کو دیکھا۔ اور وہ
بے شمار مہمان جو نہ جانے کہاں کہاں سے چل کر آئے تھے۔ اوا ٹھو پھر میور پنگ
دوپٹہ میرے سر پر ڈال دیا اور مجھے اٹھا کر لوگوں کے درمیان لے آئی"(۳۴)

ہر کوئی اپنے آپ میں مصروف ہوتا ہے۔ کسی کو یہ تک پرواہ نہیں ہوتی کہ اس نے شادی کرنی ہے کہ نہیں۔ جس طرح ایک بے جان شئے کی خرید و فروخت کی جاتی ہے اسی طرح ایک عورت کی شادی بھی دیہی معاشرے میں ایک بے جان شے کی طرح کر دی جاتی ہیں۔ جسے اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ لینے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ کوئی رائے دینے کا حق رکھتی ہے۔ بھیڑ بکریوں کی طرح اسے ڈولی میں سوار کر دیا جاتا ہے۔ ڈولی میں سوار ہوتے ہوئے اس کی آواز اور صورتحال ایسی ہو جاتی ہے کہ جس طرح ایک بکرہ ذبح

ہوتے ہوئے بے بس ہوتا ہے۔

"لو دیکھو تم نے تو آئینہ دیکھا ہی نہیں۔اس نے پہلو سے ایک آئینہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ مگر میں نے اس چہرے کو پہچانا ہی نہیں۔۔۔ مگر ایک ہنسی میرے حلق سے اٹک اٹک کے نکلی۔ایسی آواز جو کسی ذبح ہوتے بکرے سے نکلتی ہو۔"(۳۵)

شادی میں خواتین کی مرضی اور رضا کو روایتی معاشرے کے اندر حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور شادی کے حوالے سے کوئی رضا نہیں لی جاتی نہ ہی اس سے پوچھا جاتا ہے۔اس کو معاشرے کی اس روایت کی وجہ سے قربان کر دیا جاتا ہے۔

"نہیں ایسا نہ کرو۔میں نے پھر التجا کرنا چاہی۔ مگر وہ تو سب کے سب میرے گرد جمع تھے۔۔۔ایک ہی گونجتی الاب ڈولی میں ہو جا سوار، سکھی رہے۔ میری آنکھیں خشک پتھر پلکیں تک جھپکنا تک بھول چکی تھیں۔"(۳۶)

خالدہ حسین نے اپنے افسانے "ڈولی" کے ذریعے شادی کے معاملات میں عورت کی زندگی میں سمجھوتے کے رخ کو پیش کیا ہے۔خالدہ حسین کے ہاں عورت کی زندگی،اس کی بے وقتی اور بے سمتی کا احساس شدت سے ملتا ہے۔ انہوں نے بحیثیت عورت روایتی معاشرے میں داخلی اور خارجی مسائل کی عمدہ عکاسی کر کے نسائی حیثیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ بچیوں کی آنکھوں سے خواب چھین کر ان کی معصومیت اور ذہانت کا خاتمہ کرنے میں روایتی معاشرے کا بہت کردار ہے۔

(د) روایتی سماج میں معاش، جنس اور شناخت کے مسائل:

روایتی سماج کے اندر معاش نسائیت کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے۔خالدہ حسین نے معاش، جنس اور شناخت کے مسائل کی عکاسی "گنگ شہزادی"، "بایاں ہاتھ"، "آگ"، "گجر"، "زمین"، "مصروف عورت" میں کی ہے۔روایتی سماج میں عورتوں کو معاش جنس اور شناخت کا مسئلہ درپیش ہے۔ خالدہ حسین نے ان مسائل کی عکاسی اپنے افسانوں کے اندر کی ہے۔افسانہ "گُنگ شہزادی" میں پہچان اور شناخت کی گہری رمزیت پائی جاتی ہے۔افسانے کا مرکزی کردار "اماں" کا ہے جو اپنے بچوں کی خاطر سلائی مشین کا کام کرتی

ہے۔ اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔ اس کے برعکس مرد کردار "والد" کا ہے جو صرف کھاتا پیتا ہے اور سوتا ہے۔ جس کو اپنے گھر کے حالات اور معاشی حالات سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ جب کہ ماں اپنے بچوں کا مستقبل سنوارنے کے لیے زمانے سے ٹکراتی ہے اور ان کی زندگی میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے آخری حد تک جاتی ہے۔ تاکہ اس کے بچے کامیاب ہوں اور خود فاقوں کی زندگی گزار کر اپنے بچوں کی خاطر دن رات محنت کرتی ہے۔:

"اماں کو آج بار بار سوئی میں دھاگا پرونا پڑ رہا تھا۔ میٹھی روٹی رکھی ہے۔ ڈولی میں کھا لے۔ فاقے کرے گئی تو رونا ہی آئے گا۔ اماں جنجلا کر بولیں۔"(۳۷)

روایتی سماج کے اندر گھر کی تمام ذمہ داریاں اور اولاد کی پرورش کی ذمہ داری عورت پر عائد کر دی جاتی ہے۔ معاشی خود کفالت کی ذمہ داری بھی نہ چاہتے ہوئے عورت کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ انسان کا پیدائشی مسئلہ معاش کا مسئلہ ہے۔ معاشرے کی عمومی سوچ اس مسئلے کو انسانیت کا مشترکہ حل ڈھونڈنے کے بجائے ایک صنف کو لاتعلق کرتی ہے۔ اس سوچ کے مطابق عورت کا کام صرف بچے پیدا کرنا ہے جبکہ معاشی کفالت کا ذمہ دار صرف مرد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معاشی مسئلہ کے حل کے لیے مناسب ذرائع کو تخلیق کیا ہے۔ جیسے زمین، پانی پہاڑ وغیرہ۔ عورت وقتی طور پر معاشی ضرورت سے دور رہتی ہے لیکن حالات کی وجہ سے عورت کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کرنے میں مجبور ہو جاتی ہے۔ مثلاً پاکستان میں ایسے مردوں کی کمی نہیں ہے جو مختلف قدرتی وجوہات کی بنا پر جیسے نشے کی لت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ خاندان کی کفالت کرنے کے بجائے گھر کی معیشت پر بوجھ بنے رہتے ہے۔ جس کی وجہ سے عورت کو ہی گھر کی معیشت کی ذمہ داری اٹھانا پڑتی ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال سے لے کر تمام ضروریات زندگی کو پورا کرنے کا باعث بنتی ہے۔

دیہی خواتین معاشی طور پر خود مختار نہیں ہوتیں۔ ان کا اپنی آمدنی پر بھی کوئی اختیار نہیں ہوتا ہے وہ اپنے بچوں کی خاطر دن رات محنت کرتی ہے ہیں تاکہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال سکے۔ دیہی عورتوں کی اکثریت اپنے شوہروں کی تابعدار ہوتی ہیں۔ اس لیے چھپ چھپا کر تمام حالات کا مقابلہ کرتی رہتی ہیں۔ دیہاتوں میں عورتوں کا سب سے بڑا مسئلہ بے روزگاری کا ہے۔ خواتین کام کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں مگر

دیہاتوں میں کمانے کے لیے کوئی ذریعہ معاش نہیں ہوتا ہے۔بے روزگاری کی سب سے بڑی وجہ معاشی بحران ہیں۔بے روزگاری کے باعث دیہاتوں میں لوگ غربت، افلاس اور بھوکے زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

خالدہ حسین نے "گنگ شہزادی" میں پہچان اور شناخت کی متلاشی عورت کی عکاسی کی ہے کہ روایتی سماج کے اندر ہمیشہ مرد کو باصلاحیت سمجھا جاتا ہے۔اس کے مدمقابل عورت صرف ایک گنگ شہزادی ہے۔ کیونکہ روایتی سماج کے اندر عورتوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لایا جاتا۔اس افسانے کے اندر بھی بھائی بہن اپنی ماں کی مالی حالات کو بہتر بنانے کے لیے سٹیج ڈراموں میں کام کرتے ہیں۔ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> "خالدہ حسین کی "گونگی شہزادی" (پہچان) اس لڑکی کے بارے میں ہے جو عمر کے اس دور میں ہے جب چیزوں نے آپس میں گڈمڈ شروع کیا۔ کبھی کبھی تو رنگوں، آوازوں اور بولتے اندھیروں کا ایسا ملغوبہ بنتا ہے کہ اس کا سر چکرا کے رہ جاتا۔"(۳۸)

بھائی بہن کو گنگ شہزادی کا رول دیتے ہیں۔بھائی بہن کو گنگ شہزادی کا رول یہ سمجھ کے دیتے ہیں کہ یہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی۔روایتی سماج کے اندر مردوں کی سوچ ہوتی ہے کہ عورت صرف گنگی ہے۔اس میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ مردوں کے مقابل کوئی امور سرانجام دے سکے:

> "اور ریہرسل؟ اس نے جیسے کسی اندھے کنویں میں سے پوچھا۔۔۔ارے ریہرسل کیسی؟ تو تو گونگھی شہزادی ہے۔بس چپکے سے بیٹھی رہنا۔۔۔ سب کچھ خود ہی ہوتا رہے گا۔"(۳۹)

خالدہ حسین نے روایتی سماج میں رہنے والی ایک ایسی عورت کی عکاسی کی ہے جس کی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لایا جاتا۔شناخت اور پہچان کی متلاشی عورت کا وجود سرشتوں کے باقیات اور بدلتی عمر کے لوازمات میں ڈھل جاتی ہے۔خالدہ حسین نے "گنگ شہزادی" میں ایک ایسی عورت کی عکاسی کی ہے جس میں صلاحتیں ہونے کے باوجود بھی معاشرے میں دبا دیا جاتا ہے۔ڈاکٹر عصمت چغتائی لکھتی ہیں۔

"خالدہ حسین اپنے زمانے کی عورت کو مروج لیبلز سے الگ کر کے اس کی از سر نو شناخت چاہتی ہیں۔ وہ معروف حقیقتوں کی پہچان رکھتی ہیں جانتی ہیں کہ عورت گونگی شہزادی ہے۔(گنگ شہزادی) وہ تو بس ٹکر ٹکر دیکھتی ہے اور سب کچھ خود بخود ہی ہوتا رہتا ہے طرح طرح کے خوف اسے اندر سے گھائل کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی پہچان چاہتی ہیں۔ میں کیا ہوں، کیوں ہوں کے سوالات اسے ڈستے ہیں۔"(۴۰)

خالدہ حسین کے ہاں دیہاتی زندگی کا ماحول اور عورت کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک وغیرہ کی ہمہ رنگ تصویر کشی ملتی ہے۔ نچلے طبقے کی عورت کی حیثیت ایک شے کی مانند ہوتی ہے۔ اسی تناظر میں خالدہ حسین کا افسانہ "زوال پسند عورت" ہے زوال پسند عورت میں خالدہ حسین نے قارئین کی توجہ اس جانب مبذول کروائی ہے کہ ایک عورت اور مکھی کی حیثیت ایک جیسی ہے۔ وجود حقیر بے جان چیز کا ہو یا اشرف المخلوقات کا دونوں کی سطحیں برابر ہیں۔ افسانہ "زوال پسند عورت" کی مرکزی کردار جو میز پر بیٹھے کچھ تحریر کرنا چاہ رہی تھی لیکن اس کے صفحے کے اوپر مکھی کہیں سے اڑتی ہوئی آئی۔ اس مکھی کو دیکھ کر مرکزی کردار نے سوچا یہ بھی اپنے معمولی کاموں کے ذریعے گھروں سے کسب معاش کے لیے نکلی ہو گئی۔ مگر ان تمام امور کے باوجود بھی اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے۔ اگر میں اس کو قلم کی نوک سے مار دوں تو اس کا یہیں خاتمہ ہو جائے گا۔ بحیثیت عورت اور مکھی دونوں کی زندگی کا اختیار معاشرے کے مردوں کے پاس ہوتا ہے۔ وہ جب چاہیں ایک قلم کی نوک سے ان کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ حالانکہ عورت لمبا سفر طے کر کے اور اپنا سب کچھ چھوڑ کے اور سب کچھ ختم کر کے شادی کر کے آتی ہے۔

" ایک مکھی کہیں سے اڑتی آئی۔ نا معلوم کتنا لمبا سفر طے کر کے۔ شاید وہ حسب معمول کام پر نکلی تھی۔ کسب معاش کرتی تھی۔ ایک عورت معمولی قد پانچ فٹ چار انچ لفظ اوڑھنا بچھونا تمام حرج مرچ کھنچتی اس قیام پر آ پہنچی۔۔۔ دو مختلف سمتوں سے آنے والے خطوط ایک نقطے پر آملے۔ اور ایک واقعہ اور ایک نقطہ رہنما ہوا۔"(۴۱)

روایتی معاشرے کی عورت اور مکھی میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ عورت کی صلاحیتوں کو دبا کر اس کا استحصال کیا جاتا ہے۔ جس سے عورتوں کی خداداد صلاحیتں دب کر رہ جاتی ہیں اور وہ مکھی کی طرح معاشرے میں مظلومیت کی زندگی گزارتی ہے۔ خالدہ حسین ایک ایسی افسانہ نگار ہیں جن کے ہاں نسائیت کے مسائل بڑی طاقت کے ساتھ آئے ہیں۔ شاید ان کی بڑی وجہ ان کا اپنا آپ بھی ایک عورت ہونا بھی ہے۔ خالدہ حسین کے ہاں روایتی مفہوم میں گہری عورت کم ملتی ہے۔ بلکہ ایک ایسی سوچنے والی عورت کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے جو اپنی شخصیت کو دبانے کے باوجود برقرار کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ صوفیانہ رنگ میں ان کی ایک کہانی "بایاں ہاتھ" میں ایک ایسی عورت ملتی ہے۔ جو زندگی کے معمولات میں اس طرح گھیری ہوئی ہے کہ عورت ہونے کا شدید احساس اور اس احساس سے پیدا ہونے والی گہری تنہائی جو کہیں کہیں اس کے تفکرات کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس افسانے کی مرکزی کردار خود کو گھریلو معاملات میں اس قدر مبتلا کر دیتی ہے کہ خارجی دنیا کی اس کشمکش میں اس کو ہوش تک نہیں رہتا کہ وہ اپنے وجود کو دوسروں کے لیے پتھر کی مانند بنا لیتی ہے۔ گھر اور اپنے شوہر کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہوتی ہے۔

> "کچھ دن تو میرے کنبے کے لوگ یہ سب کچھ دیکھتے اور برداشت کرتے رہے۔ پھر سب کو میرے چہرے کی لاتعلقی اور آنکھوں کے خالی پن سے کوفت ہونے لگی۔ میرے زوج نے تنگ آ کر کہا مجھے لگتا ہے میں کسی پتھر کے ساتھ عمر کاٹ رہا ہوں ۔۔۔ جب اپنے حواس پر سے میرا ایمان اٹھ گیا کچھ روز تو اپنے آپ کو ملامت کرتی رہی اور میں نے اپنے آپ کو خوب خوب کوسا کہ اے بنت حوا لعنت ہے تجھ پر کہ انسان ہوتے ہوئے کوئی اپنے حواس کی نعمتوں سے فیض یاب نہ ہو۔ چناچہ میں نے اپنے اپ پر سو بار لعنت کی۔"(۴۲)

خارجی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہتا مگر ایک دن افسانے کی مرکزی کردار بازار جاتی ہے تو بازار کے اندر شوپیس میں سجی چیزوں کو دیکھ کر اس کے اندر کی عورت مست ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ پھر ایک مرتبہ مادیت کو توڑ کر رومانیت کی طرف جانے کی کوشش کرتی ہے نمود و نمائش کو ترک کرنے کی خواہش عورت اپنی زندگی

میں رکھتی ہے۔

"میں اپنے خالق کے حضور بہت روئی۔ گڑگڑائی کہ مجھے اس آنکھ کے عذاب سے پناہ میں رکھ۔ کہ یہ وہ کچھ دیکھتی ہے جو اسے نہیں دیکھنا چاہیے۔ اور مجھے خود میری ذات سے پناہ میں رکھ۔ یہ بڑی سفاک ہے۔ کب اپنی جان پر ظلم کرنے پر آتی ہے۔ تو ٹلتی نہیں۔"(۴۳)

خالدہ حسین نے اپنے افسانے "بایاں ہاتھ" میں ایک ایسی عورت کی عکاسی کی ہے۔ جس پر غیر معمولی ذمہ داریاں اور بوجھ ڈال دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ اپنی ذات کو بھی وقت نہیں دے سکتی اور نہ ہی گھر کے دیگر افراد کے لیے اس کے پاس وقت ہوتا ہے۔ خارجی دنیا سے انجان یہ عورت جب بازار میں شوپیس میں سجی چیزوں کو دیکھتی ہے تو وہ اپنے اندر یہ خواہش پیدا کر لیتی ہے لیکن فوری طور پر اس کے ذہین میں یہ خیال آتا ہے کہ ایسی زیب وآرائش ہمارے لیے نہیں ہے۔اسی تناظر میں ایک اور افسانہ "آگ" بھی ہے۔ افسانہ "آگ" میں خالدہ حسین نے ایک عورت کی محنت اور جستجو جو زندگی بھر اپنے گھر بار کے لیے کرتی ہے اس کی محنت کو رائیگاں جاتے ہوئے دیکھایا گیا ہے۔

"سب گھر مطمن اور روشن تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا آگ کے سراغ میں وہ کتنا دروں کا سفر کر کے آئی تھی۔ اس نے اپنے گھر کی گھنٹی بجائی کچھ دیر بعد اس کی بیٹی نے دروازہ کھولا۔ اس کی آنکھوں کے گرد خوابی کے سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ کون؟ کس سے ملنا ہے۔ پھر بیٹا اور چھوٹی بیٹی بھی آ گئے۔ اور آدھ کھلے دروازے سے سر نکال کر سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے تب سب سے اوپر اس کے اوپر اس کا چہرہ نمودار ہوا کس نمبر میں جانا ہے۔"(۴۴)

افسانہ "آگ" کے اندر خالدہ حسین نے روایتی معاشرے کے اندر ایک عورت کی تمام محنت اور جستجو جو ساری عمر اپنے بچوں اور شوہر کے لیے کرتی ہے۔ اس کو بے کار ہوتے دیکھایا گیا ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار جو اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے گھر سے باہر آگ دیکھنے جاتی ہے کہ آگ کہاں لگی ہوئی ہے۔ جب

ایک دروں کا سفر طے کر کے واپس آتی ہے تو اس کے بچے ہی اس کو پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

روایتی معاشرے کے تناظر میں دیکھا جائے تو نسائیت کو ایک مسئلہ خود داری اور انا پرستی کا بھی ہے۔ روایتی معاشرے کے اندر عورت مذہب اور سماج میں الجھی ہوئی گھر گرہستی سنبھالتی ہوئی اور اچھی یا بری عورت بننے کے چکر میں دکھائی گئی ہے جیسے زندگی کا بسر بھی سماج کے اصول و قواعد کو مد نظر رکھ کر کرنا پڑتا ہے۔ علوم و فنون تک رسائی اس کے لیے منع ہے۔ اس کا مقصد حیات محض مردوں کی تفنن طبع ہے۔ اس کے علاوہ اس کا اپنی زندگی پر کوئی اختیار نہیں ہوتا ہے اور اس کشت کے باوجود اچھے اور برے ہونے کی سند بھی سماج اور مرد نے ہی عطا کرنا ہوتی ہے۔ اس افسانے کی مرکزی کردار بھی ایسے ہی مسئلے سے دوچار نظر آتی ہے۔ اس کی زندگی محض چار دیواری میں محدود ہے جس کو باہر جانے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔ ایک مکان سے دوسرے مکان کو محض اپنی نظروں سے ہی دیکھ سکتی ہے۔

" جب وہ کواٹروں کی چھت پر چڑھ کر دیکھتی تو اسے حیرت ہوتی کہ خاموش سڑکوں کے دوروایہ پھیلے سب کے سب گھر صرر د درواز ں کے راستے ایک دوسرے سے کس قدر دور۔ "(۴۵)

خالدہ حسین نے جنسی استحصال کو بھی اپنے افسانے کے اندر موضوع بنایا ہے کہ مرد ہمارے معاشرے میں حاکمیت رکھتا ہے۔ مرد کے سامنے عورت حقیر مخلوق اور کمزور ہے۔ روایتی معاشرے کے اندر گھریلو زندگی سے لے کر معاشرتی زندگی کے تمام پہلوؤں میں صنفی امتیاز کی جھلک نظر آتی ہے۔

خالدہ حسین نے عورت کے ساتھ استحصال کو مختلف صورتوں میں بیان کیا ہے کہ مردانہ معاشرہ میں مرد اپنی جنسی تسکین کے لیے عورت کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔ عورت کی نفسیات اور ذہنی صورتحال کو سمجھنے کی بجائے اس کے جذباتی قتل کو فوقیت دی جاتی ہے۔ علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:

" جنسی انحرافات سے مراد جنسی خواہش کی تسکین کے لیے ایسا طریقہ اختیار کرنا جو طبعی معمول سے مختلف ہو اور جو اپنی انتہائی صورت میں جنسی ملاپ کا بدل بن جائے

ہر شخص میں جنسی انحراف کے ممکنات پائے جاتے ہیں۔ جو لوگ جنسی لحاظ سے بظاہر
نارمل دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں بھی انحراف کا میلان موجود ہوتا ہے۔"(۴۶)

جنسی استحصال کی عکاسی افسانہ "گجر" کے کردار "بیگم سراج کی بیٹی نسیم" کے ذریعے کی گئی ہے۔ جس کو جسمانی ہوس کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ جسمانی ہوس کا نشانہ بنانے والا مرد ڈرائیور معاشرے میں طاقتور فرد ہوتا ہے تو اس کی طرف انگلی کوئی بھی نہیں اٹھاتا۔ لیکن اس جسمانی ہوس کی شکار عورت کی مدد کرنے کے لیے بھی کوئی تیار نہیں ہوتا۔

"بیگم سراج کی بیٹی نسیم سلوٹوں بھری ریشمی ساڑھی میں ننگے پاؤں باگ چلی آئی تھی
اور ڈرائیور چپل گھسیٹتا اپنے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ خدا کے لیے جلدی کرو۔ یہ لو
چابی اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ مگر بی بی ہسپتال تک پہنچا کر چلا آؤں گا۔ آپ
جانیں یہ پولیس کیس۔ میں غریب ملازم آدمی ہوں خواہ مخواہ۔۔۔"(۴۷)

جنسی استحصال کی شکار عورت کے ساتھ معاشرہ بھی نہیں رہتا۔ روایتی معاشرے کے اندر ماں باپ عزت اور غیرت کی وجہ سے ایسے معاملات کو دبا دیتے ہیں۔ کیونکہ جاگیر داروں اور وڈیروں کا مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہ افسانہ بلاواسطہ اور بلواسطہ مردانہ معاشرہ میں عورت کا نقطہ نظر اور اس کے مسائل کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس افسانے کے ذریعے خالدہ حسین نے عورت کے مسائل کی عکاسی کی ہے کہ عورت معاشرے کے اندر بہت مظلوم اور بے بس ہوتی ہے۔ جاگیر دارانہ معاشرے میں عورت کی حیثیت منقولہ جائیداد اور آشیائے صرف کی طرح ہوتی ہے۔ عورت کا جذباتی اور جنسی استحصال روایتی معاشرے میں معمول کی بات ہے جاگیر دار حاکم اعلیٰ ہوتے ہیں اور یہ نظام آج بھی جوں کا توں قائم ہے۔ یہ نظام نہیں بدلا۔ زمانہ بدل گیا ہے لیکن دیہاتوں میں عورتوں کی قسمت نہیں بدلی۔

خالدہ حسین نے روایتی معاشرے کے اندر دنیا سے کنارہ کشی کر کے اپنی ایک الگ دنیا بسانے والی خواتین کی بھی عکاسی کی ہے۔ دیہاتوں کے اندر آج بھی تعویذ گنڈھوں، جادو ٹونہ، پیر و مرشد پر یقین کیا جاتا ہے۔ بعض خواتین اپنے اندر ہی کشمکش میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ان کا رشتہ کسی روحانیت کے ساتھ جڑ گیا ہے۔

افسانہ "زمین" کی مرکزی کردار "شیریں" کا ہے جو ہر وقت خود کو خوف ،وہم اور تنہا محسوس کرتی تھی۔ اس کے ارد گرد بہت سے لوگ ہونے کے باوجود بھی وہ اپنا رشتہ بڑے سید جی کے ساتھ جوڑے رکھتی تھی۔ اسے ہمیشہ ہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے اندر سانس لے رہی ہے اور بعض اوقات اس کشمکش میں مبتلا رہتی کہ یہ وجود بھی اس کا اپنا ہے یا نہیں۔

> " تمام گھر میں نیند بھری سانسوں کا راگ بھرا ہوتا اور شیریں کو وہم سا ہونے لگتا ہے کہ سب انسانوں کے ساتھ اس کا وہ پراسرار رشتہ ہے جو بڑے سید جی کی واردات تھا اور وہ محسوس کرتی جیسے وہ دوسروں انسانوں کے اندر سانس لے رہی ہے بلکہ وہ سب اس کے اندر سانس لیتے ہیں۔ اور اس طرح دوسروں کے ساتھ ایک ہونے پر وہ اپنا وجود یاد کرتی اور خوف کھاتی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ نہ ہو۔"(۴۸)

خالدہ حسین نے اپنے اس افسانے میں نسائیت کے ان مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ تعلیمی شعور نہ ہونے کے باعث خواتین نفسیاتی مسائل کا شکار ہو کر علیحدگی اختیار کر لیتی ہیں۔ نفسیات کے حوالے سے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> " نفسیات ایسا علم ہے جو فرد کے کردار کا سائنسی مطالعہ اس کے ماحول میں کرے۔"(۴۹)

افسانہ "زمین" میں خالدہ حسین نے کرداروں کے عمل اور ردِ عمل کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار "شیریں" کا ہے۔ خالدہ حسین نے "شیریں" کی نفسیاتی الجھنوں کا ذکر کرنے سے پہلے ان تمام تر سماجی الجھنوں اور پریشانیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں شیریں نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو جاتی ہے۔ نفسیاتی کشمکش میں شکار ہونے کی ایک اہم وجہ ہم عمر بچوں کا ایک موازنہ کیا جاتا ہے۔ ہر وقت کا موازنہ بچے کے ذہن پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ کیونکہ اس وجہ سے ایک بچہ احساس کمتری اور احساس برتری کا شکار ہو سکتا ہے۔ گھر والوں کی عدم توجہی کی بنا پر "شیریں" کی حالت درست نہ ہوتی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کی نفسیات پر اس کے گرد و نواح کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ انسان یا تو اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ یا

اس کے خلاف ردِ عمل کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ "شیریں" کا کردار بھی اس کی سب سے اہم مثال ہے۔ جو ماحولیاتی جبر سے تنگ آ کر مذہب اور معاشرے کی قیود سے خود کو قید کر لیتی ہے۔ اور وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتی ہے جیسے وہ بڑے سید جی کی دنیا میں سانس لے رہی ہے۔

خاور نقوی لکھتے ہیں:

> "خالدہ حسین نے علم و عرفان کی منزل کے راستے کی دشواریوں اور پیچیدگیو ں کو مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔۔۔۔اپنے وجود کی حقیقتوں کی تلاش راہ کے مسافر کو کئی سخت مقامات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انھوں نے ہمیں بتایا ہے کہ روحانیت کی منزل کو پانے کے لیے انتہائی صبر وضبط اور مسلسل ریاضت کی ضرورت ہے جو شخص کڑی آزمائشوں سے گزر کر اس منزل کو حاصل کر لیتا ہے"(۵۰)

خالدہ حسین نے افسانہ "مصروف عورت" کے ذریعے روایتی معاشرے میں موجود ایسی خواتین کی عکاسی کی ہے جن کو اتنے امور در پیش ہوتے ہیں کہ وہ وہی کام نہیں کر پاتیں جسے وہ اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھتی ہیں خالدہ حسین کے مطابق لفظ "عورت" ہی ایک مصروف وجود ہے۔ گھر کے تمام امور کی ذمہ داریاں اور بے جا بوجھ عورتوں پر ہی ڈال دیا جاتا ہے۔ خالدہ حسین نے غیر فطری زندگی گزارنے والے عورتوں کے جذبوں عکاسی کے لیے اپنائے گئے راستوں کی نشاندی کی ہے۔ دیہی زندگی کا ماحول، فضا، غلام در غلام نسلوں کی سوچ توہمات، معاشرتی دشواریاں، ذات برادری کا سسٹم اور دیگر کئی پہلوؤں کا سامنا بھی عورت کو بعض اوقات اکیلے ہی کرنا پڑتا ہے۔ ہل، کھیت، چارہ، گائے، بھینسوں کی دیکھ بھال تمام امور کی ذمہ داری روایتی معاشرے کی عورتوں پر بلواسطہ اور بلاواسطہ عائد کر دی گئی ہے۔ زندگی کے ناقابل برداشت بوجھ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خاتون خانہ بھی ہو تو اس کے کندھوں پر دوہری ذمہ داری ہوتی ہے۔

> "اب میں آپ سے درخواست کروں گئی کہ یہ لفظ (عورت) کو سین کر دیجیے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ مجھے صرف ایک مصروف وجود سمجھا جائے۔ چلیے اصولی طور پر نہیں تو صرف چند لمحوں کے لیے ضرور تاً۔"(۵۱)

مصروف عورت دن بھر اپنے مختلف کردار نبھاتی ہے۔ روزمرہ کی مصروفیات میں اس کو اتنے امور سر انجام دینے ہوتے ہیں کہ وہ اس کام کو انجام نہیں دے سکتی۔ جس کے لیے اس کو تخلیق کیا گیا ہے۔ وہ گھریلو امور کے حوالے تمام کام سر انجام دیتی ہے۔ خالدہ حسین کے "مصروف عورت" کے مجموعے کے نام سے ہی ان کے کام میں نسائی رویے کا اظہار ہوتا ہے۔ جس میں وہ عورت معاشی، نفسیاتی اور گھریلو مسائل کو یکساں اہمیت دیتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مرتضیٰ علی اطہر، ڈاکٹر، فہمیدہ ریاض کی شاعری میں جدید عورت، کتابی دنیا دہلی، ۲۰۰۹، ص ۱۳

۲۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، جدید اردو فکشن، عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات، شرکت پرس لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶۸

۳۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر، اردو افسانے میں علامت نگاری، ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۲۰ء ص ۲۶۰

۴۔ خالدہ حسین، ایک بوند لہو کی، مشمولہ پہچان، خالد پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۹، ص ۱۶

۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر رویے اور شناختیں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۳

۶۔ خالدہ حسین، نامہ بر، مشمولہ، دروازہ، خالد پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۲۳

۷۔ فتح محمد ملک، تحسین و تردید (خالدہ حسین کا صوفیانہ انداز نظر)، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۵ء ص ۹۹

۸۔ ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، پاکستانی اہل قلم خواتین ایک ادبی جائزہ، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۳، ص ۱۹۶

۹۔ انتظار حسین، خالدہ حسین کی پہچان (مضمون)، مشمولہ: علامتوں کا زوال، مکتبہ نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص

۱۰۔ خالدہ حسین، آخری سمت، مشمولہ پہچان، ص ۶۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۶

۱۳۔ خالدہ حسین، دھوپ چھاؤں،، مشمولہ دروازہ، ص ۲۸

۱۴۔ خالدہ حسین، دہان زخم، مشمولہ: دروازہ، ص ۳۷

۱۵۔ حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو افسانے کی روایت، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۹۹

۱۶۔ خالدہ حسین، جاڑو مشمولہ ہیں خواب میں ہنوز، دوست پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۹، ص ۲۰

۱۷۔ ایضاً ص ۱۹

۱۸۔ خالدہ حسین، جو کچھ جیسا ہے، مشمولہ: ہیں خواب میں ہنوز ص ۲۰

۱۹۔ خالدہ حسین، چوبارہ مشمولہ دروازہ ص ۷۰

۲۰۔ ایضاً ص ۱۷

۲۱۔ صباحت مشتاق، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب کا تنوع تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، ذکریا یونی ورسٹی، ملتان، ۲۰۰۶ء، ص، ۲۱۳

۲۲۔ خالدہ حسین، الاؤ، مشمولہ دروازہ، ص ۱۰۷

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۲۵۔ خالدہ حسین، والعصر مشمولہ میں یہاں ہوں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۷

۲۶۔ ایضاً، ص ۶۶

۲۷۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، جدید اردو فکشن عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات، شرکت پریس لاہور ۲۰۱۰ء، ص ۱۷۲

۲۸۔ خالدہ حسین، یار من بیاہ، مشمولہ میں یہاں ہوں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۲

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۴

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۲

۳۲۔ خالدہ حسین، ادبیات، جلد ۱۴۔۱۵، شمارہ ۵۹۔۶۰، انتخاب خواتین کا عالمی ادب، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴

۳۳۔ ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، علامہ اقبال یونیورسٹی اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۳۵۳

۳۴۔ خالدہ حسین، ڈولی، مشمولہ، مصروف عورت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۹، ص، ۴۴

۳۵۔ ایضاً، ص ۴۵

۳۶۔ ایضاً، ص ۴۵

۳۷۔ خالدہ حسین، گنگ شہزادی، مشمولہ: پہچان، ص ۲۳

۳۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، مجموعہ ڈاکٹر سلیم اختر، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۸۴۔۱۸۳

۳۹۔ خالدہ حسین، گنگ شہزادی، مشمولہ: پہچان، ص ۲۳

۴۰۔ عصمت چغتائی، ڈاکٹر، نسائی شعور کی تاریخ اردو افسانہ اور عورت، مقتدرہ قومی زبان پاکستان ۲۰۱۲، ص ۲۳۵

۴۱۔ خالدہ حسین، زوال پسند عورت، مشمولہ، مصروف عورت، ص، ۱۰۳

۴۲۔ خالدہ حسین، بایاں ہاتھ، مشمولہ، پہچان، ص، ۱۹۹

۴۳۔ ایضاً، ص ۲۰۱

۴۴۔ خالدہ حسین، آگ، مشمولہ، مصروف عورت، ص، ۱۳۲

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۳۳

۴۶۔ علی عباس جلالپوری، جنسیاتی مطالعے، اکرم پریس، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۱۲

۴۷۔ خالدہ حسین، گجر، مشمولہ، مصروف عورت، ص، ۱۹

۴۸۔ خالدہ حسین، زمین، مشمولہ دروازہ، ص، ۶۸

۴۹۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، ڈاکٹر، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۲۰۱

۵۰۔ خاور نقوی، پوٹھوہار میں اردو افسانہ نگاری، کاشف بک ڈپو، اسلام آباد ۱۹۹۷ء، ص ۱۱۹

۵۱۔ خالدہ حسین، مصروف عورت، مشمولہ، مصروف عورت، ص ۸۴

باب سوم

خالدہ حسین کے افسانوں میں جدید سماجی تناظر اور نسائی مسائل: تجزیاتی مطالعہ

شہری زندگی میں بے پناہ چمک دمک اورآن بان ہوتی ہے۔شہروں میں دیہاتوں کی نسبت زیادہ سہولیات ہوتی ہیں۔ تعلیم، صحت اور روزگار کے مواقع میسر ہوتے ہیں۔شہروں میں عورتیں مردوں کے برابر کام کرتی ہیں۔جدید معاشرے میں مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔اگر دونوں میں سے کوئی ایک معذور ہوتا ہے تو دوسرا اس کی کفالت کی ذمہ داری اپنے اوپر عائد کرلیتا ہے۔شہروں میں آرام اور آسائش کا رجحان بھی زیادہ ہوتا ہے۔مالی اعتبار سے ہر کوئی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کررہاہوتا ہے۔

جہاں شہروں کے اندر دیگر سہولیات میسر ہوتی ہیں، وہیں خاص کر عورتوں کو بھی بہت سارے مسائل کا سامنا کرنا پڑرہا ہے۔جدید معاشرے میں عورتیں مختلف نوعیت کے مسائل سے دوچار ہیں۔یوں تو پوری دنیا میں عورتیں جبر، امتیازی سلوک اور استحصال کا شکار ہیں لیکن پاکستان کے شہری معاشرے میں یہ مسائل بہت شدت کے ساتھ موجود ہیں۔زیادہ تر خواتین ان مسائل سے دوچار نظر آتی ہیں۔عموماً محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والی عورتوں کو ان مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ڈاکٹر فردوس انور قاضی لکھتے ہیں:

> "خالدہ حسین کی رومانیت تنہائی اور لایقینیت کے احساس میں دبی ایک دھندلی روشنی کی مانند ہے۔جس پر خوف کا سایہ لہراتا ہے۔۔۔اکیلا رہ جانے کا خوف ہو یا مستقبل کی غیر یقینی صورت حال، رشتے ٹوٹنے کا خوف ہو یا تنہائی کا۔ان افسانوں میں خوف کی یہ کیفیت اتنی زیادہ حاوی ہے کہ ان افسانوں سے اس کیفیت کو نکال لیا جائے تو افسانہ اپنی توانائی کھو دیتا ہے۔"(۱)

جدید معاشرے کی عورت تعلیم میں کہیں آگے ہونے کے باوجود بہت سے منافع بخش شعبوں میں

ملازمت سے محروم ہے۔ دیہاتوں میں تو عورتوں سے کھیتوں اور گھروں کے ہزار ہا کام کروائے جاتے ہیں مگر ایک پڑھی لکھی عورت اگر دفتروں میں کام کرنا شروع کر دے تو ان کی غیرت پتا نہیں کہاں سے جاگ جاتی ہے۔ گویا جدید معاشرے کے اندر مسئلہ چار دیواری کا نہیں رہ گیا بلکہ مسئلہ منفی سوچ کا ہے جو عورت کو خود مختار اور مردوں کی برابری کی سطح پر نہیں آنے دے رہا۔ جدید معاشرے میں ملازمت پیشہ خواتین کے حقوق، تحفظ اور ان کے ساتھ روا جنسی امتیاز کو سامنے رکھتے ہوئے بہت سارے قوانین بنائے گئے ہیں۔ مگر عملی طور پر جدید معاشرے کے اندر عورت آج بھی اپنے حقوق کے لیے جنگ لڑ رہی ہے۔ ایک عام عورت آج بھی اپنا آپ منوانے کے لیے تک و دو میں مصروف ہے۔

مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ پڑھی لکھی اور باصلاحیت ہیں۔ پرائیوٹ سکولوں اور کالجز میں پڑھی لکھی نوجوان لڑکیوں کو ملازمت دے دی جاتی ہے۔ مشرق کی عورت جتنا مرضی پڑھ لکھ جائے، تاہم وہ آج بھی ایک عام عورت ہی ہے اور ملازمت کے لیے گھر سے باہر نکلے تو بس سٹاپ پر تماش بینوں کا رش لگ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ یہ بھی ہے کہ پڑھی لکھی اکثر خواتین شادی کی عمر سے آگے نکل رہی ہیں اور پڑھی لکھی لڑکیاں مناسب رشتوں کے چکر میں کنواری رہ جاتی ہیں۔ اس طرح جدید معاشرے کے اندر خواتین کے مسائل ہر شعبے میں کم ہونے کی بجائے بڑھتے جا رہے ہیں۔

خالدہ حسین نے عورتوں کی سماجی حیثیت کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔ جدید معاشرے میں عورتوں کے مسائل کے حوالے سے قلم اٹھایا ہے اور ایسی عورت جس کے پاس معاشرتی الجھنوں اور دباؤ کو سہ لینے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہوتا۔ اردو افسانے کے اولین دور میں جدید معاشرے میں نسائیت کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں فرد بالخصوص خواتین کے مسائل کی طرف توجہ دی گئی ہے اور ایسے افسانے تخلیق کیے گئے جن میں معاشرتی اعتبار سے خواتین کے مسائل کو اجاگر کیا گیا۔ اس دور میں تمام مصنفین کی توجہ جدید معاشرے کی طرف مبذول تھی۔ اس لیے ایسے موضوعات سے متعلق افسانے تخلیق کیے گئے جن میں نسائیت کے مسائل کی پیش کش کی جا سکے۔ اردو ادب کے ترقی یافتہ دور میں شامل ہونے تک

حالات واقعات کے انسانی زندگی پر اثرات، انسان کی نفسیاتی کشمکش اور جنسی معاملات و مسائل سے متعلقہ موضوعات پر بھی لکھا گیا۔ شیر محمد اختر لکھتے ہیں:

"انسان اور حیوان میں ایک جنسی جبلت بھی ہے۔ اس جبلت کی وہی حیثیت مانی گئی ہے جو بھوک کی جبلت ہے۔ خوراک حاصل کرنے سے اس کی تسکین ہوتی ہے۔ اسی طرح جنس کی خواہش بھی اپنا مقصد حاصل کر کے تسکین پاتی ہے۔"(۲)

عورتوں کی حقوق آزادی اور تعلیم ایک ناگزیر ضرورت بن کر ادب کا موضوع بننے لگے۔ تخیل کی جگہ حقائق نے لے لی۔ عورت صدیوں سے ہی محکومیوں کا شکار رہی ہے۔ اس کو رائے دینے کا حق نہ تھا۔ کبھی اپنا نقطہ نظر بیان نہیں کر سکتی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا عورت کے حقوق پر بات کی جانے لگی۔ بیسویں صدی اور اکیسویں صدی کی نمائندہ ادیب خواتین کی بات کی جائے تو انھوں نے مختلف رجحانات اور تحریکوں کی نمائندگی کی۔ اسی پس نظر میں لکھنے والوں کی ایک وہ قسم سامنے آئی جنھوں نے گھریلو ماحول کی عکاسی، پہچان کی گمشدگی، جنسی بے راہ روی اور عدم تشخص جیسے موضوعات کو ادب میں نظر انداز نہیں کیا۔

اردو ادب میں عورتوں کے حقوق میں آواز بلند کرنے میں اہم ترین نام رشید جہاں اور عصمت چغتائی کا ہے۔ جنھوں نے عورتوں کے حوالے سے تمام ایسے موضوعات کو تحریر کیا جن کے لیے رشید جہاں اور عصمت چغتائی کے قلم کی ہی ضرورت تھی۔ رشید جہاں اور عصمت چغتائی وہ سنگ میل ہیں جن سے پہلے اور جن سے بعد کے افسانوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ان کی پیروی کرنے والوں میں ہاجرہ مسرور بھی شامل ہیں جنھوں نے عورتوں کے حقوق کے لیے قلم اٹھایا۔

آزادی کے بعد جہاں بہت سے شعبوں میں تبدیلی آئی وہاں عورت کے بارے میں تصورات بھی بدلے۔ اب عورت کے بارے میں نئے مسائل اور نئے تصورات سامنے آنے لگے۔ عورت کاروبار زندگی میں مرد کے برابر تو آگئی لیکن نئے مسائل پیدا ہوئے مثلاً خاندان اور اس کے ساتھ پروان چڑھتے ہوئے دوسرے رشتوں کا انہدام، گھر سے باہر کام کرنے والی عورت کی حیثیت سے ذمہ داریوں میں تبدیلیوں کی نوعیت۔ لیکن گھر کی سطح پر مردوں کا ان تبدیلیوں کو تسلیم کرنے سے انکار، عورت پر گھر اور باہر کے کاموں کا

دوہرا بوجھ وغیرہ۔ جدید معاشرے کے اندر عورت کو سب سے زیادہ عدم تحفظ کا مسئلہ درپیش ہے۔

خالدہ حسین کا شمار ایسے لکھنے والوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تحریر سے پڑھنے والوں اور ناقدین فن کو متاثر کیا ہے۔ ان کی تحریروں کی دو خوبیاں بہت نمایاں ہیں۔ ایک اسلوب کی ندرت اور دوسرا مختلف افراد کے واقعات کے بارے میں ان کا بے باک یک طرفہ رویہ۔ ان کے اولین افسانوی مجموعے دروازہ، پہچان، ہیں خواب میں ہنوز، میں یہاں ہوں اور مصروف عورت میں جدید معاشرے کی خواتین کے مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کے خیال میں معاشرہ اپنی تمام تر ترقی کے باوجود عورت ذات کو مقصد بالذات تسلیم نہیں کرتا بلکہ مقصد کے حصول کے لیے ایک ذریعہ ہے۔ اس لیے جدید معاشرے کے اندر عورت کا مقدر محرومی ہے۔ خالدہ حسین نے اپنی تحریروں میں اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کمزور کیوں ہے اور ہمارا سسٹم عورت کو تحفظ دینے میں ابھی تک کیوں نہیں کامیاب ہو سکا۔ لالہ دیال لکھتے ہیں:

> "زمانہ جدید کی عورت کو زمانہ گزشتہ کی ماتاؤں کی اپنی عصمت وعفت کی حفاظت کر کے اپنی جنسی پاکیزگی و تقدیس کو بھی محفوظ رکھنا چاہے اور اس کی عظمت و شان بڑھانے کے لیے دیگر ہر طرح کی صفات اور خوبیاں اپنے اندر پیدا کر کے ہمیشہ کوشاں رہنا چاہیے۔"(۳)

جب تک خاندان کی اکائی کا نظام قائم رہا فرد کو عدم تحفظ کا سامنا نہ تھا لیکن صنعتی ترقی خاندان کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں توڑنے کی وجہ بنی۔ صنعتی ترقی سے قبل ہمارا معاشرہ زرعی معاشرہ کے قواعد وضوابط کے مطابق چل رہا تھا۔ شہری معاشرے کے افراد کم از کم گلی کی سطحوں تک ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شامل ہو جاتے تھے۔ مگر صنعتی ترقی کی ذہنیت اور ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر فوقیت دینے کے رجحان نے فرد کو بالکل ایک دوسرے سے بیگانہ کر دیا اور ایک عام شہری سائنسی ایجادات اور دیگر سہولیات کے ثمرات سے فیاض یاب ہونے کے باوجود عدم تحفظ کا نشانہ بن چکے ہیں۔ جدید معاشرے کے اندر چھیڑ جانے والی جنگیں خواتین کے لیے انتہائی جان لیوا بن چکی ہیں۔

الف) جدید زندگی کے تصورات اور نسائی تشخص کے مسائل:

جدید معاشرے کی عورت کو ایک اہم مسئلہ نسائی تشخص کا درپیش ہے۔ خواتین کو عدم تحفظ کا خوف نفسیاتی کشمکش میں مبتلا کر رہا ہے۔ دن کو باہر نکلتے ہوئے وہ ایک نادیدہ خوف میں مبتلا دکھائی دیتی ہیں۔ نسائی تشخص کے مسائل کی عکاسی خالدہ حسین نے اپنے افسانوں "منی" اور "زمین" میں کی ہے۔ جدید اردو افسانے میں عدم تحفظ کے اس موضوع پر قارئین کی توجہ مبذول کروائی گئی ہے۔ خالدہ حسین کے افسانوں میں بھی ایسے کردار ملتے ہیں جو محسوس کرتے ہیں کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اس کی عکاسی ان کے افسانے "منی" میں ملتی ہے۔ جس کا کردار "منی" ہے۔ جس کے والدین رقیہ باجی کے اصرار پر اپنا گھر بیچ کر گلبرک کوٹھی میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

اس افسانے کی مرکزی کردار اپنے وجود کی متلاشی نظر آتی ہے۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانے میں عدم تحفظ کی جانب توجہ مبذول کروائی ہے کہ افسانے کی مرکزی کردار "منی" کو گلبرک میں منتقل ہونے کے بعد بھی یوں لگتا ہے کہ جیسے اس کے وجود سے کوئی چیز گم ہو گئی ہے۔ دس سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود بھی وہ گلبرک کالونی میں ایڈجیسٹ نہیں ہو سکی۔

> "اس کی آنکھیں کہیں دور دراز کے نقطے پر جم کر بکھرنے لگتیں۔ مارے خوف کے اس کے جسم کا رواں رواں کانپ جاتا۔ حاجن مائی کی ایسی ہی نگاہوں سے اس کے ذہن کا کوئی نامعلوم سا رشتہ تھا۔ کوئی انجانی قوت اسے فضا میں بکھیرتی۔ اس نگاہ سے قریب تر کھینچ لے جاتی جیسے مقناطیس اس کے بالوں کی پنوں کو اپنے سینے سے چمٹا لیتا تھا۔"(۴)

افسانہ "منی" میں عورت وجودی مبادیات کے ساتھ ماضی کی یادوں اور حال کے تناظر میں چھپکلی کی علامت میں کراہت اور کرب کی نمائندگی کرتی ہے۔

"اندر صحن میں لوہے کا جنگلہ تھا۔ اور نیچے بھی بڑا گہرا صحن تھا کنویں جیسا تو پھر؟ وہ ہنسنے لگا اور سامنے کے مکان میں کوئی مر گیا تھا تو لکڑی کے جنگلے والا پلنگ آیا تھا۔ ایک چھپکلی اس کی نواڑ میں سے نکل کر زمین پر بھاگ گئی تھی۔"(۵)

عدم تحفظ کی شکار افسانے کی مرکزی کردار "منی" جس کو ہمیشہ یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی اس کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ گلبرک کالونی میں منتقل ہونے کے بعد بھی اسے اپنا وجود ادھورہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کا وجود کہیں اور ہے۔ مارے خوف کے وہ کانپ جاتی۔

"رفتہ رفتہ اس کا شک یقین میں تبدیل ہونے لگا۔ اس جگہ کے علاوہ وہ کہیں اور بھی موجود تھی۔ اپنے وجود کے پھیلنے کے اس احساس سے مارے خوف کے وہ کانپ جاتی۔ اس کے اندر ایک بھیانک خلا پھیلتا جا رہا تھا۔ ہر لمحے اس کو یوں لگتا جیسے وہ کوئی بڑا ضروری کام بھول گئی ہے۔ وہ کسی انجانے سفر کے لیے ہر دم تیار رہتی۔۔۔ اور اپنے آپ کو یقین دلاتی رہتی۔ میں یہی ہوں محض یہی۔"(۶)

عدم تحفظ کی شکار "منی" اپنے وجود کی متلاشی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنے کے باوجود بھی خود کو محفوظ نہیں سمجھ رہی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر اپنے آپ کو کہیں اور محسوس کرتی تھی۔ اسے یہی لگتا تھا کہ اگر وہ دوبارہ پہلے گھر میں چلی جائے تو شاہد اس کو سکون آجائے۔ وہ سکول میں بھی جاتی تو اسے گھر آنے کا انتظار رہتا۔ اسے یہی محسوس ہوتا کہ اگر وہ واپس گھر چلی جائے تو اس کے انتظار کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن جب وہ گھر پہنچی تو اس کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

"اسکول میں وہ تمام دن چھٹی ہونے کا انتظار کرتی رہتی۔ گھر۔ گھر۔ گھر اس کی کن پٹیوں میں ایک ہی لفظ بن کر گونجتا رہتا۔ مگر گھر میں داخل ہوتے ہی اسے شدید احساس ہوتا یہ وہ جگہ نہیں ہے جہاں اسے پہنچنا تھا۔"(۷)

خالدہ حسین نے افسانہ "منی" میں شناخت اور پہچان کی گہری رمزیت کی عکاسی کی ہے۔ عدم تحفظ اور پہچان کی متلاشی عورت کا وجود بدلتی عمر کے لوازمات کی باقیات میں ڈھل جاتا ہے۔ "شہر پناہ" افسانے میں خالدہ حسین نے عورت کو فطری ارتقا کے ساتھ ترجیحات اور بدلتے معیارات کے ساتھ دکھایا ہے۔ جس سے

عورت کی زندگی کے بدلتے ہوئے معیارات اور عدم تحفظ کا احساس ابھرتا ہے۔ افسانہ "شہر پناہ" میں مرکزی کردار "گڈو" ہے۔ جدید معاشرے کے اندر مرد اور عورت اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے خواہاں ہیں۔ عورت آزادنہ طور پر ایک ادارے کے اندر پڑھائی لکھائی کے فرائض سرانجام دے رہی ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ ان میں ایک اہم مسئلہ عدم تحفظ کا ہے۔ "گڈو" اور "ظفر" ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ "گڈو" کی بہن "گڈو" کو "ظفر" سے دور رہنے کا مشورہ دیتی تھی۔ لیکن اسے اس کی باتوں کا کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ جدید معاشرے میں تعلیم اور شعور ہونے کے باوجود بھی خواتین عدم تحفظ کا شکار نظر آتی ہیں۔ خواتین گھر سے باہر ایسے مسائل سے دوچار ہو جاتی ہیں جس سے نہ چاہتے ہوئے بھی تحفظ محسوس نہیں کر سکتی۔ باشعور خواتین بھی عدم تحفظ کے احساس کی وجہ سے داخلی سطح پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار نظر آتی ہیں۔

> "جاتے ہوئے جب ظفر نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا تو اسے یوں ہی کچھ وہم سا ہوا کہ اس کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔۔۔ دراصل وہ کیا ہے دیکھنے والی آنکھ اور دیکھی جانے والی آنکھ کے ملاپ کے تصور سے اس کا دل لرز گیا۔ خوف زدہ ہو کر اس نے سوچا کہ اب وہ ظفر پر ہنس نہ کر سکے گئی۔"(۸)

عدم تحفظ کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب اعتماد کی کمی ہوتی ہے۔ شاہد اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی بھی بچے کو پیار اور حوصلہ افزائی نہیں ملتی۔ والدین میں مسلسل لڑائی جھگڑے بچوں کے اوپر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ افسانہ "منی" میں بھی مرکزی کردار ماضی اور حال کے تناظر میں کرب کی نمائندگی کرتی ہے۔

> "اسے خود بھی احساس تھا کہ جان کا اتنا عزیز رکھنا بڑی گھٹیا سی بات ہے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ اسے جان اتنی پیاری نہ تھی، دراصل اسے منظر خوف زدہ کرتے تھے حادثے نہیں۔ کیونکہ منظر تو وجود پانے سے پہلے ہی کے ذہن میں موجود تھے۔ اسے معلوم ہوتا کہ جب وہ باہر کی دنیا میں سامنے آ کھڑے ہو گئے تو کتنے بھیانک ہوں گئے۔"(۹)

جدید معاشرے میں تعلیم اور شعور ہونے کے باوجود بھی معاشرے میں خواتین عدم تحفظ کا شکار نظر آتی ہیں۔ خواتین کو گھروں سے باہر طرح طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی پڑھی لکھی خواتین تحفظ محسوس نہیں کر سکتیں۔ ان مسائل نے جدید معاشرے کی باشعور خواتین کو داخلی سطح پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار کر دیا ہے۔

جدید معاشرے کے اندر عورت کو داخلی اور خارجی سطح پر بے شمار مسائل کا سامنا ہے۔ عورت کی حیثیت بھی ایسی ہو گئی ہے کہ وہ بے جان چیزوں کی طرح اپنی اصلیت قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ وجود کی شناخت خالدہ حسین کا ایک اہم موضوع ہے۔ ان کے ہاں داخلیت اور خارجیت کی آمیزیش سے کہانی ترتیب پاتی ہے۔ مکالمے کا مرکزی کردار ایک ایسی لڑکی ہے جو اپنی زندگی بدلنے کے لیے وقتی طور پر اپنی حالت بدلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ افسانہ "مکالمہ" میں صوفے کے ساتھ ایک عورت کا خاموش مکالمہ ہے۔ جو صوفے کی طرح رنگ بدلتی پرانی ہوتی اور پھر نیا غلاف چڑھانے پر وقتی طور پر یا بظاہر اپنی حالت بدلنے پر کامیاب تو ہو جاتی ہے لیکن فرق دونوں میں اس قدر ہے کہ بے جان چیز اپنی اصلیت برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہے جبکہ عورت اس معاملے میں ناکام رہتی ہے۔

> "اسے اپنے گھر کا پرانے سے پرانا فرنیچر اب تک یوں یاد تھا گویا وہ سب کی سب چیزیں اس کے ساتھ زندہ رہتی چلی آئی ہوں۔ اب اس کے ساتھ سانس لیتی ہوں۔۔۔ بے جان اشیاء کے ساتھ محبت اسے ورثے میں ملی تھی۔ کہیں کرسیاں، الماریاں، تخت، تکیہ شروع ہی سے اس کے رازدان چلے آرہے تھے۔"(۱۰)

بہت سے بچے اپنے ماں باپ کے پیار اور توجہ سے محروم رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان بچوں کے اندر اعتماد کی کمی ہوتی ہے۔ والدین میں مسلسل لڑائی جھگڑا اور حوصلہ افزائی کی کمی کی وجہ سے بعض بچے عدم تحفظ کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ اس احساس کو دل سے نکالنے کے لیے گھر میں پڑی ہوئی کسی بے جان چیز کو اپنا راز داں بنا لیتے ہیں۔ گھر کے ماحول کی وجہ سے اور بعض اوقات اپنی شکل وصورت کی وجہ سے بھی عدم تحفظ اور احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ خالدہ حسین نے بھی اپنے افسانے میں ایک ایسی عورت کی عکاسی کی ہے جو گھر

کے تمام افراد کی لاپرواہی کی وجہ سے اپنا تعلق صوفے کے ساتھ قائم کر لیتی ہے۔

جدید معاشرے میں ایک اہم مسئلہ تنہائی، کرب، وہم اور نسائی تشخص کا بھی ہے۔ مشینی دور میں جہاں لوگوں کو بہت ساری سہولیات میسر آئی ہیں وہیں انسان اور مشینوں کے درمیان ہم آہنگی کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔ مشین کی رفتار سے انسان کام کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ مشین کی رفتار سے ہم آہنگی کی وجہ سے انسان خصوصیات سے محروم ہوتا چلا گیا۔ محبت جیسے جذبے کمزور پڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ انسان خود ایک مشین بن کر رہ گیا۔ مشینی دور کی وجہ سے آج کا انسان سماجی روابط اور رشتوں میں دراڑیں اور بے حسی کا شکار ہو گیا ہے۔ اس تناظر میں خالدہ حسین کا افسانہ "زمین" ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار "شریں" ہے۔ جس کے ارد گرد بہت سے لوگ موجود ہیں۔ مگر وہ خوف، وہم اور نسائی تشخص کا شکار ہے اور خود کو تنہا محسوس کرتی ہے۔ کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ چند لمحے ایک دوسرے کے ساتھ گزار سکے۔ آگے بڑھنے کی دوڑ میں انسان نے انسانیت سے ہی منہ موڑ لیا ہے۔ جس کی وجہ سے جدید معاشرے کا فرد تنہائی، وہم اور خوف میں مبتلا ہے۔ مرد چونکہ گھر کے باہر کہیں بھی چلے جاتے ہیں لیکن عورتیں چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے انسانی تشخص کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اکیلے رہتے ہوئے خواتین کے ذہنوں میں تنہائی کا خوف، لوگوں کے غائب ہو جانے کا خوف اور بیشتر ڈر دماغ میں بیٹھ جاتا ہے۔

> "شریں نے گرمیوں کی بھری دوپہر ایک ہوک سنی اور اس نے اس طرح خوف کھایا کہ اس سے قبل نہ کھایا تھا۔ یوں خوف وہ شروع ہی سے کھاتی چلی آئی تھی۔ اندھیرے اور تنہائی کا خوف، لوگوں کے غیب ہونے، مر جانے کا اندیشہ، طرح طرح کے حادثوں اور اپنے سے بہتر نظر آنے والے تمام انسانوں کا ڈر۔"(۱۱)

خوف انسان میں پایا جانے والا وہ نفسیاتی رویہ ہے جو ذہن کے اندر کسی خطرے سے آگائیت کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ خوف نفسیاتی کشمکش کا موجب بنتا ہے۔ انسان کی زندگی کو خوف نے مختلف حوالوں سے جکڑا ہوا ہے۔ اس طرح "شیریں" کا کردار بھی نسائی تشخص میں مبتلا نظر آتا ہے جو پیدائش کے بعد والدین کی محبت سے محروم کر دی گئی تھی۔ یوں اس کی شخصیت کی مناسب نشوونما نہیں ہو سکی۔

"ایک دھندلا سا احساس اسے یہ ہوتا کہ اب جو کچھ ہو رہا ہے آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ کسی اور دنیا میں ہو رہا ہے۔ جہاں ہمارے دوسرے وجود موجود ہیں اور ایک اپنا آپ ہم اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ یوں ایک دوسری دنیا میں منتقل ہو جانے پر بہت سے وہمے حقیقت اور حقیقتیں وہم۔"(۱۲)

(ب) جدید زندگی کا تمدنی اور اخلاقی نظام:

جدید زندگی کے تمدنی اور اخلاقی نظام کی عکاسی خالدہ حسین نے اپنے افسانوں "تفتیش"، عجائب گھر" اور "رہائی" میں کی ہے۔ جدید معاشرے کے اندر لا قانونیت کا مسئلہ درپیش ہے۔ جدید معاشرے میں قوم بدامنی اور لا قانونیت کا شکار ہو چکی ہے۔ پاکستان کو غیر مستحکم بنانے میں بعض لوگ کئی سالوں سے مصروف ہیں۔ امن وامان پورے ملک میں بری طرح متاثر ہوا ہے۔ شہری سخت مایوسی اور بزدلی کا شکار ہیں۔ کسی بھی محلے میں اگر کوئی واقعہ ہو جائے تو پورا محلہ خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ جدید معاشرے میں ان واقعات سے ہر کوئی اچھی طرح آگاہ ہے۔ رشوت، جھوٹ اور لالچ نے لا قانونیت جیسے مسائل کو جنم دیا ہے۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے جب کسی گنہگار کو بچانے کے لیے اس کی مدد کرتے ہیں تو رشوت لے کر ایک بے گناہ آدمی کو سولی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ لا قانونیت نے پاکستان کے قانون کو ایک گہری سازش کے تحت کمزور کر دیا ہے۔ حالانکہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ کس منشور کے تحت پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ وہ منشور آج تک پورا نہیں ہو رہا۔ غریب طبقے کے لوگ لا قانونیت کی وجہ سے غریب تر ہوتے جا رہے ہیں جبکہ امیر لوگ امیر سے امیر تر ہوتے جا رہے ہیں۔

پاکستان میں لاکھوں لوگ آج بھی بے روزگاری، جہالت اور غربت کا شکار ہیں۔ حکومتِ وقت نے ان محروم طبقات کی بہتری کے لیے کوئی ایسے اقدامات نہیں کیے جن سے ان کی صورتحال میں بہتری آسکے۔ آبادی میں بے پناہ اضافے کی وجہ سے بھوک کے شکار لوگ مایوسیوں اور محرومیوں میں بری طرح جکڑ چکے ہیں۔ پڑھے لکھے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بے روزگار ہیں۔ وہ پیچیدہ جرائم کا شکار ہو رہے ہیں اور جرائم کا شکار ہونے والے افراد اپنی بے بسی اور مایوسی کی وجہ سے اس جانب راغب ہوتے ہیں۔

بعض اوقات معاشرے کا بے گناہ فرد لا قانونیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ جدید معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہ

ہے کہ انصاف کی فراہمی فرد کے ظاہری حلیے کو دیکھ کر دی جاتی ہے۔ اگر ایک شخص بے گناہ ہے لیکن اس کا ظاہری حلیہ اس کو مجرم ثابت کر دیتا ہے۔ افسانہ "تفتیش" میں خالدہ حسین نے لا قانونیت کے مسئلے کی عکاسی کی ہے کہ افسانے کی مرکزی کردار جو گھریلو خاتون ہے اپنے شوہر کی خدمت کے ساتھ گھر کے دیگر کام بھی کرتی ہے۔ ایک سرکاری ملازم کی بیوی ہے۔ ایک دن جب وہ گھر آتی ہے تو اس کے خلاف نوٹس آتا ہے اور اس کو تفتیش کے لیے بلایا جاتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نہیں نکلتی لیکن نوٹس آنے پر اس کو مجبوراً گھر سے باہر اکیلا ہی جانا پڑتا ہے۔ وہ جب وہاں پہنچتی ہے تو دیکھتی ہے کہ وہاں عورتیں برقعے اور نقاب میں ہوتی ہیں۔

جدید معاشرے کے اندر آج بھی عورتیں عدالت جا کر سچ اور جھوٹ میں فرق کو واضح نہیں کر سکتیں۔ ان کے اندر اتنا حوصلہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر سکیں۔ افسانے کی مرکزی کردار جب عدالت پہنچتی ہے تو بے گناہ ہونے کے باوجود بھی وہ اپنے سچ کو ثابت نہیں کر سکتی۔ تفتیشی افسران بار بار اس سے پوچھتے ہیں کہ تم کون سے گروہ میں شامل ہو۔ وہ بار بار ان کو بتاتی ہے کہ وہ ایک گھریلو خاتون ہے لیکن سچ ثابت کرنے کے لیے افسران اس کے ساتھ آلہ چپکا دیتے ہیں۔

> "گروہ؟ دیکھیں میں ایک گھریلو عورت ہوں۔ اب بھی میرے ہاتھوں میں صابن کی مہک ہے۔۔۔ گروہ میں شامل ہونے کا میرے پاس وقت ہے نہ ضرورت۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو مہربانی ہو گئی۔۔۔ آپ کی ہٹ دھرمی یہاں نہیں چلے گئی محترمہ۔ دوسرے نے تنگ آ کر کہا آپ کی یہ حرکت آپ کے خلاف گواہی دیتی ہے۔ ہمارا یہ آلہ کبھی غلط نتائج نہیں دیتا۔ اس کی مسلسل سرخ روشنی دیکھیں۔ ہمیں کسی اور رویے پر مجبور نہ کیجیے۔"(۱۳)

خالدہ حسین کہتی ہیں کہ جدید معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ انسان کو ماپنے کے لیے آلے ایجاد ہو چکے ہیں۔ اب آلے یہ فیصلہ کریں گے کہ انسان کی اصل حقیقت کیا ہے۔ انسان بذات خود اپنی اصلیت کو منوانے میں ناکام ہو چکا ہے۔

افسانہ "رہائی" میں خالدہ حسین کی عورت نفرت، تشکیک اور عدم تحفظ کا شکار ہونے کے باوجود بھی مرد سے نفرت نہیں کرتی بلکہ اس سماج میں خوف اور عدم تحفظ کا شکار ہونے کے باوجود بھی خود کو اس دنیا سے

وابستہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ متوسط طبقے کی عورت بے جوڑ رشتوں کی پاداش میں عدم مطابقت کی اذیت کی بھرپور عکاسی "رہائی" میں ملتی ہے۔ خالدہ حسین اپنے مخصوص علامتی رنگ سے ہٹ کر بیانیہ انداز اختیار کرتی ہیں جو معاشرے کی خستہ حال عورتوں کی پیچیدگیوں کی گرہ کشائی میں ماہر ہے۔ جدید دور کے اندر چیزیں اور لوگ ایک دوسرے کے لیے بے معنی اور بے کار ہو گئے ہیں۔ عورت کی حیثیت ایک ایسی چابی کی ہو گئی ہے جس کا تالا ہی نہ بنا تھا یا کسی انجانی جگہ کسی کنڈے میں بند لٹکتا رہ گیا۔ اس افسانے کی مرکزی کردار انجانے خیال میں خود کو کمرے میں قید کر لیتی ہے۔ بہت کھولنے کے باوجود بھی اس سے دروازہ نہیں کھلتا۔ بچے اور شوہر کو دیر بعد پتا چلتا ہے کہ وہ اندر قید ہو گئی ہے۔

> "اس طرح چیزیں اور لوگ ایک دوسرے کے لیے بے معنی اور بے کار ہو جاتے ہیں۔ شاہد وہ بھی ایک ایسی چابی تھی جس کا تالا نہ بنا ہو۔"(۱۴)

کمرے میں بند ہونے کے بعد مرکزی کردار نے زور زور سے اپنے بچے کو بلایا۔ "بنٹی" پاپا کو جا کر بتاؤ کہ ماں اندر بند ہو گئی ہے۔ اس کو کھولنے کے لیے کئی جتن کیے جاتے ہیں۔ وہ بہت دیر تک کمرے میں احساس جرم، کرب، مایوسی، اکتاہٹ اور خوف و ہراس کی کیفیت میں مبتلا رہتی ہے۔ اسی دوران وہ اپنے جذبات واحساسات کو بچپن میں سنی گئی کہانی کوئے اور چڑیا کی داستان کا گ رس سے جوڑتی ہے۔ جس میں چڑیا عورت کی علامت اور قینچی مخالف قوتوں کی علامت بن کر پوری فضا میں چھا جاتی ہے۔ یعنی کہ آج کے جدید دور کے اندر قینچی کے ذریعے عورتوں کے پر کاٹ دیے جاتے ہیں۔ ان کو گھروں میں مقید کر دیا جاتا ہے۔ مگر وہ مردوں کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہیں اور یہی احساس مرکزی کردار کو مجرم بنا دیتا ہے۔ اس احساس میں جب وہ مبتلا ہوتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو چھوڑانے کے لیے مستری آ گیا ہے۔

> "مگر دروازہ تو ایک دھکے سے ہی کھل گیا۔ آہ کیسے۔۔۔؟ اور مستری کا چہرہ دھند میں لپیٹا ہے اور ہاتھ میں وہ قینچی جس کا ایک پھل مشرق سے مغرب، دوسرا شمال سے جنوب تک پھیلا ہے۔ شمال اور شاہد اور بہت سے تماشائی کھڑے دیکھتے ہیں۔ جبکہ قینچی اس پر جھکی چلی آ رہی ہے۔"(۱۵)

خالدہ حسین نے اس افسانے میں عورت کی بے بسی، مجبوری اور مایوسی کی صورتحال کو پیش کیا ہے۔ مرکزی کردار صبر آزما کیفیت کو موضوع بنایا ہے۔ جس میں خالدہ حسین نے ایک ایسی عورت کی کہانی بیان کی ہے جو اپنے گھر میں ہی قید ہو جاتی ہے اور مشکلات کا شکار ہو جاتی ہے۔ زندگی کا ناقابل برداشت بوجھ، رنگ کا خاتمہ، معاشی بوجھ اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو منوانے کے لیے عورت عملی میدان میں گرداں نظر آتی ہے جب وہ خاتون خانہ بھی ہو تو دوہری ذمہ داری اس کے کندھوں پر آن پڑتی ہے۔ ورکنگ لیڈی کا گھر بچے، رشتہ دار اور ملازمت کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے خود ہی لڑنا پڑتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ عورت کے بے شمار جسمانی اور ذہنی مسائل میں کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ ورکنگ لیڈی کی اپنی شخصیت بالکل ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک روبوٹ کی طرح اس کی زندگی حرکت کرنے لگتی ہے۔ بعض اوقات جذباتی اور ذہنی طور پر اتنی تھک جاتی ہے کہ اسے زندگی سے سکون کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ خالدہ حسین نے ورکنگ لیڈی کی ہفتہ بھر کی مصروفیات، گھریلو ذمہ داریوں، دفتری الجھنوں اور جھنجلاہٹ کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ ورکنگ لیڈی کے لیے اپنے لیے لذت کشید کرنے کا اسے زندگی کے لمحوں میں وقت ہی نہیں ملتا۔ اینٹی ڈپریشن گولیاں کھانا، نیند کی کمی کے شکار میں مبتلا رہتی ہیں۔ جدید معاشرے کے اندر انسان چلتی پھرتی مشین بن کے رہ جاتا ہے۔

> "اس روز بھی دفتر سے واپسی پر میں اس اطمینان سے سرشار تھی کہ میری سانس بغیر کسی رکاوٹ کے آجا رہی ہے اور جسم کا تمام نظام صحیح چل رہا ہے۔۔۔ آدمی کی چھٹی حس اسے بتاتی ہے کہ اب کچھ ہونے والا ہے۔ پہلے کبھی تو میں خواب وغیرہ دیکھ لیا کرتی تھی۔ مگر اب تو مدتوں سے ایک چلتی پھرتی نیند میں ہوں۔"(۱۶)

ورکنگ لیڈی کا ایک مسئلہ خود کو معاشرے میں موجود مردوں کی ہوس ناک نگاؤں سے بچانا بھی ہے۔ ہر عورت کو گھر سے باہر نکلتے وقت مشکوک سمجھ لیا جاتا ہے۔ گھر کے اندر اور باہر بہتان اور طعنوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے ذہنی طور پر دباؤ کا شکار رہتی ہے۔ اس افسانے کی مرکزی کردار بھی جب جاب کر کے گھر آتی ہے تو دن بھر کی تھکان کے باعث آرام کرنا چاہتی ہے۔ اس کا شوہر "ظفر" اس کو بتاتا ہے

کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے تو وہ حیران و پریشان ہو کر کمرے کی جانب چلی جاتی ہے۔ کمرے میں بیٹھی عورت اسے اپنا تعارف کرواتی ہے اور بتاتی ہے کہ میں تمہاری کتاب پر مقدمہ کرنے والی ہوں۔ سوچا پہلے تمہیں بتا دوں۔ خالدہ حسین نے افسانہ "عجائب گھر" میں ذریعے ورکنگ لیڈی کے ذریعے ایک اور احساس پہلو کی نشاندی کی ہے کہ گھر کے اندر بھی شادی شدہ عورتوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس طرح افسانے کی مرکزی کردار کو جب یہ پتا چلتا ہے کہ اس پر مقدمہ ہونے والا ہے تو فوراسوچتی ہے:

> "میں یک بستہ رہ گئی۔ سب سے پہلے مجھے ظفر کا خیال آیا جو دن رات میری حرکات کو نہایت مشتبہ نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ ہر فون کال اور ڈاک کے پرکارے اور مراسلے پر اس کے ماتھے کی شکنیں تڑپنے لگتیں اور نتھنے پنکھے کی طرح پھڑکنے لگتے۔ اگر مجھے عدالت میں گھسیٹ لیا گیا تو اس کے تمام شکوک سچ ثابت ہو جائیں گئے۔"(۱۷)

(ج) جدید زندگی میں عائلی مسائل و معاملات:

خالدہ حسین نے جدید زندگی میں خواتین کے عائلی مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ جدید معاشرے کے اندر جہاں عورت دیگر مسائل میں گھیری ہوئی ہے وہاں ہی عائلی مسائل میں جکڑی ہوئی ہے۔ عائلی مسائل کی عکاسی خالدہ حسین نے اپنے افسانوں "نام کی کہانی"، "آدھی عورت"، "پہچان" اور "دھند" میں کی ہے۔ عورت گھر تک محدود ہو تو گھریلو مسائل میں گھیری رہتی ہے۔ گھر سے باہر بھی جائے تو بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس حوالے سے خالدہ حسین نے عورت کی ازلی بے بسی، جنسی و جذباتی استحصال اور عائلی زندگی کے مسائل و معاملات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ بحیثیت عورت اپنے افسانوں میں عورت کی مظلومیت، بے بسی اور اس کی لاچاری کی تصاویر پیش کرتی ہیں۔ کشور ناہید لکھتی ہیں:

> "کسی ملک میں جرائم کی رفتار اس ملک کی کی سماجی اور ذہنی پرورش کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ عورتوں میں جرائم کا بنیادی سبب جہالت، ناواقفیت اور بے جا پابندیوں کے

باعث لاعلمی ہے۔۔۔ شہروں میں عورتوں کو شناخت، عائلی مسائل کا سامنا زیادہ رہتا ہے۔"[۱۸]

ان کے افسانے "نام کی کہانی" میں خالدہ حسین پہچان کے حوالے سے عورت کی شناخت کی فکر مند ہیں۔ خالدہ حسین کے افسانوں میں عورت کا جو روپ سامنے آتا ہے وہ خوف، بے بسی، نفرتوں اور غصے سے تشکیل دیا ہوا ہے۔ معاشرے کے اندر مرد اور عورت دونوں بہت اہم ہوتے ہیں۔ ازدواجی زندگی سے حسن اور راحت پیدا ہوتی ہے۔ عائلی زندگی میں اگر مسائل و معاملات نہ ہوں تو یہ سفر حسین ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس رشتے کے اندر ناچاکی، کڑواہٹ، نفرت اور علیحدگی کا عنصر آجائے تو بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ عورت حسن، تعلیم اور مالی حیثیت سے شوہر سے برتر ہو تو اس کا ناروا سلوک اور عدم توجیحی زندگی کو اجیرن کر دیتی ہے۔ جس طرح مرد کو عورت کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح عورت کو بھی مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ محمد حمید شاہد لکھتے ہیں:

> "خالدہ حسین کا شمار ان افسانہ نگاروں میں نہیں کیا جا سکتا جو اپنے ادھر ادھر بکھرے ہوئے مظاہر کے ملائم اور چکنے حصّوں پر پھسلتے پھیلتے رہتے ہیں اور نہ ہی یہ ان لوگوں میں سے ہے جو تلخ زندگی کے خارجی نوکیلے اور کھردرے حصّوں پر ہی سر پھوڑنے کو تخلیقیت گردانتے ہیں۔ خالدہ حسین کا معاملہ یہ ہے کہ وہ مادی تفہیم سے آگے نکل جاتی ہے۔ وہ مسلسل اسی کوشش میں رہتی ہے کہ تہہ میں اترے اور نظر آنے یا محسوس ہونے والے کی ماہیت اور اصل کو پالے۔"[۱۹]

ازدواجی زندگی میں عورت خود مختاری کے نام پر مرد سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتی اور نہ ہی کھل کر مردوں کے خلاف اپنی برتری ثابت کرنا چاہتی ہے۔ عورت جانتی ہے کہ اس کا وجود مرد کے بغیر بنجر کھیتی کی طرح ہے۔ مرد کی وجہ سے زندگی کا حسن قائم ہوتا ہے۔ عورت اپنے گھر کے لیے اور مرد کے لیے اپنے جذبے اور تن من وار دیتی ہے۔

شمع خالد لکھتی ہیں:

"دیکھیے جی مرد وعورت برابر نہیں ہو سکتے ۔جسمانی طور پر بھی دونوں مختلف ہیں۔۔۔مرد کی برتری تو ہے اور ہر طرح سے فرق بھی۔۔۔جہاں تک آزادی یا قید کی بات ہے تو دونوں قید ہیں۔ کہیں عورت مظلوم ہے تو کہیں مرد۔"(۲۰)

مرد گھر کا حکمران ہوتا ہے۔عورت کو اپنا غلام سمجھتا ہے۔عورت چاہتی ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو کمتر، کم عقل اور کمزور مخلوق نہ سمجھے۔بیوی اور شوہر کا رشتہ باہمی ادب واحترام پر قائم رہتا ہے۔لیکن پاکستان کے جدید معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ مرد خود کو حاکم سمجھتا ہے۔مرد کی حیثیت گھر میں ایک حکمران کی طرح ہے۔حکمران جب بھی کوئی فیصلہ اپنی رعایا کے لیے کرتا ہے تو رعایا کو نہ چاہتے ہوئے بھی ان فیصلوں کا ماننا پڑتا ہے۔ان کو فیصلوں کے خلاف احتجاج کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہوتا۔عورت کی حیثیت بھی جدید معاشرے کے اندر یک ایسی رعایا کی ہے جو فیصلوں کو چپ چاپ مان لیتی ہے اور اگر کوئی ان فیصلوں کے خلاف احتجاج کرے تو اسے نام سے بے نام ہونے کا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔اس خوف سے دوچار افسانہ "نام کی کہانی" میں افسانے کی مرکزی کردار بھی نام سے بے نام ہونے کا سفر طے کرتی ہے۔

"اول تو یہ نام بھول جانے کا قصہ ہی عجیب تھا۔کہ حرف سب کے سب موجود تھے اور مل کر ایک نام اب بھی بنائے تھے اور اسے یہ معلوم تھا کہ یہی اس کا نام ہے مگر مشکل یہ تھی کہ پہلے یہ لفظ وہ خود تھی مگر اب وہ محض خول تھا۔وہ اس کے اندر موجود نہیں تھی۔اب معلوم نہیں کہ اصل نام وہ خول تھا یا وہ خود۔اس کا کوئی نام نہیں تھا۔اس لیے سب کام تھم گئے تھے۔"(۲۱)

خوف اور بے بسی کی فضا "نام کی کہانی" میں پائی جاتی ہے۔نام سے بے نام ہونے کے باوجود کہانی کا کردار آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہے۔کہانی کی مرکزی کردار بے نام ہونے کے باوجود امید کا دامن چھوڑ رہی ہے اور خوف سے دوچار نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

"ان کے کردار ایک پراسرار دہشت اور خوف میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ پہچان کے گم شد ہو جانے اور زندگی کی بے معنویت کا المیہ ان کے کرداروں سے ہمہ وقت چپکا نظر آتا ہے۔ خالدہ حسین نے اس المیے کو بار ہا اپنی ذات کے حوالے سے پیش کیا۔ موت، تنہائی، اداسی اور بے معنویت کو انھوں نے عصری مفاہیم میں بھی دکھایا اور خود اپنی ذات کے خلا میں بھی ان کی حیثیت مرتب کرنے کی سعی کی۔"(۲۲)

ان کے افسانے "نام کی کہانی" میں آغاز سے آخر تک خوف، مایوسی اور کم ہمتی کا احساس بہت گہرا نظر آتا ہے۔ جدید سماج کے اندر مرد اور عورت آزادانہ طور پر اپنی زندگی بسر کرنے کے خواہاں ہیں۔ جدید دور کے اندر بھی عورت اپنے وجود کا تحفظ شوہر کی وجہ سے محفوظ سمجھتی ہے۔ آج بھی عورت مرد کے بغیر اکیلی زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ زندگی گزارنے کے لیے عورت کو مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن جدید دور کے اندر عورت کو سب سے زیادہ مسئلہ خانگی زندگی میں درپیش ہے۔ طلاق کا مسئلہ جدید معاشرے کے اندر پروان چڑھ چکا ہے۔ اس افسانے کی مرکزی کردار کو جب "جمیل" چھوڑ دیتا ہے تو اسے سمجھ ہی نہیں آ رہی ہوتی کہ اب اس کے نام کی کیا پہچان رہ گئی ہے۔ اس کا وجود کیا ہے۔ اس کی شناخت کیا ہے۔ افسانہ "نام کی کہانی" سے بھی وجودیت کے مباحث کے ساتھ کشف زاد کی دریافت کا عمل بے زاری اور گھٹن کے ماحول میں پھنسی ہوئی عورت کی تصویر کشی ملتی ہے۔

"ایک مدت تک وہ اپنے نام کا شدید احساس کرتی چلی آئی تھی مثلاً جب جمیل نے اسے چھوڑا تو اسے ہر دم اپنے نام کا احساس رہتا وہ لوگوں سے الگ موجود تھی۔"(۲۳)

دراصل خالدہ حسین نے خوف اور پہچان جیسے روایتوں کو علامتی انداز میں پیش کر کے ایک عورت کے جذبات، دلی کیفیات اور محسوسات کو بڑے متاثر کن الفاظ میں پیش کیا ہے۔ آج کے دور کے اندر بھی عورت اپنے آپ کو مرد کے نام کے ساتھ محفوظ سمجھی جاتی ہے۔ آج بھی عورت مرد کے بغیر اپنا تصور بھی قائم نہیں رکھ سکتی۔ اگر کسی وجہ سے طلاق ہو جائے تو عورت کو یہی محسوس ہوتا ہے کہ اب اس کے وجود کا یہیں

خاتمہ ہو گیا ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"وہ مرد کے سہارے کی محتاج ہے۔بغیر خاوند کے وہ بالکل صفر بن جاتی ہے۔غرض یہ کہ ہر لحاظ سے اسے مقابلتاً مرد سے کمزور قرار دیا جاتا ہے۔وہ مرد کے برابر نہیں اور اسے زیادہ سے زیادہ جو درجہ مل سکتا ہے وہ نصف بہتر کا ہے۔"(۲۴)

جدید معاشرے کی عورت کی حیثیت آج بھی مرد کے بغیر صفر ہی ہے۔مرد کا جب جی چاہتا ہے اپنی انا کی تسکین اور جھوٹی مردانگی ثابت کرنے کے لیے عورت کو چھوڑ دیتا ہے اور طلاق کی کند چھری سے اس کا قتل کر دیا جاتا ہے۔خالدہ حسین نے افسانے "نام کی کہانی" میں عورت کی زندگی میں سمجھوتے کے اس رخ کو پیش کیا ہے۔

خالدہ حسین مرد اور عورت کے رشتے میں منافقت کی وضاحت کرتی ہیں۔روایتی تصور عورت پر ہمیشہ حاوی رہتا ہے۔جس کے مطابق اس کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔اگر وہ کبھی اپنی اصلیت کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ بھی کر لے تو سزا اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

"اب راتوں کو جاگ جاگ کر کپڑوں پر قطعی غیر ضروری کڑھائی کی۔گوٹا لچکا لگایا۔پھر سب گھروں کی سلائی کا ذمہ لیا۔۔۔مگر مصروفیت کے باوجود جیسے رات کے ساتھ پہلے دن جو پورے کا پورا کٹ جایا کرتا تھا اب نہ کٹتا۔پہلے اس نے دیکھا کہ اس کی تمام ہڈیاں گوشت کی دبیز تہوں میں جا چھپیں اور اب اس کی پہچان مٹی۔۔۔وہ بدل چکی تھی کچھ اور بن چکی تھی۔پھر اسے گوشت کا بوجھ اپنے جسم سے الگ محسوس ہونے لگا۔جیسے وہ منوں گوشت کا لوتھڑا ہو۔"(۲۵)

افسانہ "آدھی عورت" میں خانگی زندگی کے حوالے سے افسانے کی مرکزی کردار کہتی ہیں کہ اگر عورت اپنی انا کو ختم کر کے اپنے آپ کو مرد کے حوالے کر دے تو وہ کامیاب ہو جاتی ہے۔مگر جہاں عورت اپنی پہچان چاہتی ہو اور اپنی انا کو عزیز رکھنا چاہتی ہو تو وہ سب کچھ کھو دیتی ہے۔کیونکہ یہ جدید معاشرہ بھی مرد کا معاشرہ ہے۔صرف مرد ہی اس معاشرے میں اپنی پہچان برقرار رکھ سکتا ہے۔خالدہ حسین مرد اور عورت

کے منافقت بھرے رشتے کی یوں وضاحت کرتی ہیں:

"مسز شوکت علی تھیں جن کا شوہر بے حد اٹلکچوئل مشہور تھا۔ اور ان کا کہنا تھا کہ مرد اٹلکچوئل ہو یا جاہل۔۔۔ برابر ہے۔ عورت اور مرد میں جنگ وہی صرف انا کی ہے۔ لہذا ہم نے تو پہلے دن ہی اپنی انا کو شوہر کے سپرد کر دی تھی کہ تو جہاں چاہے اس کو دیا سلائی دکھا دو یا جھاڑو پونچھ کے ناک میں رکھ دو۔ ہمیں اس سے کچھ مطلب نہیں اور بقول ان کے خود قلعہ بند ہو گئی۔ نہ ان کے اصل وجود تک شوہر کی رسائی ہوئی نہ آشنائی و بیگانگی کا چکر پڑا خوب گزر رہی تھی۔۔۔ ان کا مقولہ تھا کہ میاں بیوی کا رشتہ نہایت ڈپلومیٹک رشتہ ہوتا ہے۔ اور جو کوئی اس حقیقت کو بھولا اس کا بیڑا غرق ہوا۔ لہذا سچائی ضمیر کی ستھرائی کے چکر میں نہ پڑو۔"(۲۶)

خالدہ حسین اپنے افسانوں میں عورت کی پہچان اور شناخت کا واضح شعور پیش کرتی ہیں اور یہ واضح کرنا چاہتی ہیں کہ آج کی عورت اپنے عصری تقاضوں کو سمجھے، معاشرے میں اپنی شناخت اور اپنے مقام کو تسلیم کروائے۔ خالدہ حسین نے عورت کے ساتھ استحصال کو عورت کی بے بسی، مجبوری، عمل اور رد عمل کے آئینہ میں منعکس کیا ہے۔

"زمانے کی قسم بیشک انسان خسارے میں ہے۔ مگر سب سے زیادہ انسانوں کی وہ جنس جو میں ہوں۔ جس طرح وقت اس جنس کو کھاتا ہے کسی کو نہیں کھاتا ہے۔ اور لمحہ لمحہ ہمارے گوشت ہماری ہڈیوں سے علیحدہ ہوتے جاتے ہیں۔"(۲۷)

"پہچان" خالدہ حسین کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔ جس میں ایک عورت ہونے اور نہ ہونے کے احساس تلے دبی نظر آتی ہے۔ یہ عورت اپنے شوہر کی تابعدار اور چار بچوں کی ماں ہونے کے باوجود شوہر کی بے زاری اور دوسری وجوہات کی وجہ سے مستقل الجھن اور تنہائی کی شکار ہے۔ وہ اپنی ذات کی موجودگی، گھر، شوہر، بچوں کی متلاشی اور خواہشمند ہے۔ لاحاصل سفر کے راستے میں اس کے ارادے بے معنویت کے حیولے بن جاتے ہیں۔

"میں نے دیکھا تھا کہ میں گلی میں جا رہی ہوں اور گلی بالکل سنسان پڑی ہوئی ہے۔ یہاں سے وہاں تک دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا۔ میں اکیلے ڈر رہی ہوں کہ

اتنے میں سامنے سے وہ سفید کپڑے پہنے ،ہاتھ میں ریکٹ لیے پسینے میں شرابور چلے آتے ہیں۔انہیں دیکھ کر میرے دم میں دم آتا ہے۔مگر وہ دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتے۔اس پر میں حیران ہوئی اور برقعہ اٹھاتی ہوں تاکہ وہ مجھے دیکھ لیں۔اس پر بھی وہ مجھے نہیں دیکھتے۔اور میرے قریب سے گزر جاتے ہیں۔میں انہیں پکارنا چاہتی ہوں اور میری آواز بند ہو جاتی ہے۔پھر میں ان کے پیچھے بھاگتی ہوں۔میرے قدموں کی آواز پر وہ پیچھے موڑ کر دیکھتے ہیں مگر ان کا چہرہ بدل چکا ہے۔وہ تو کوئی اور ہیں۔معلوم نہیں کون، میں سہم جاتی ہوں۔اور اس پر مجھے شک ہوتا ہے کہ شاہد میرا چہرا بھی بدل چکا ہے۔پھر میں اپنا گھر ڈھونڈنا چاہتی ہوں مگر تمام گلی کے مکان ایک سے ہیں۔"(۲۸)

خالدہ حسین عائلی مسائل، پہچان اور شناخت کے واضح شعور کے ساتھ احساس دلانا چاہتی ہیں۔خالدہ حسین کے افسانوں کی عورت جدید معاشرے میں عائلی مسائل، پہچان اور عدم تحفظ کا شکار نظر آتی ہے۔شاہد یہی وجہ ہے کہ عصر کی جبریت اور کشیدگی نے معاشرے میں خلا پیدا کیا ہے۔انسان تنہائی کا شکار ہو گیا ہے۔خالدہ حسین جدید معاشرے کی عورت کے دکھ ،کرب اور درد کی عکاسی اپنے افسانوں میں کرتی ہیں۔انہوں نے اپنے افسانے "دھند" میں مردانہ بے حسی کو بیان کیا ہے۔مرد اور عورت ایک ساتھ رہنے کے باوجود بھی ایک دوسرے سے بے زار رہتے ہیں۔مرد اپنے آپ میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اس کو اپنی بیوی کا حلیہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس نے آج کون سے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔مردانہ بے حسی جو بیویوں کے ساتھ کی جاتی ہے خالدہ حسین نے اسے متاثر کن انداز میں بیان کیا ہے۔

افسانہ "دھند" میں خالدہ حسین نے ایک ایسے شادی شدہ جوڑے کی کہانی بیان کی ہے جو شادی کے بعد ایک عرصے تک اکھٹے رہ رہے ہوتے ہیں۔مگر ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے۔اس کہانی میں بیوی ایک بس سٹاپ پر اپنے شوہر کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔شوہر اسے بتاتا ہے کہ وہ کچھ دیر تک وہاں پہنچے گا۔لیکن جب شوہر وہاں پہنچتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی وہاں موجود نہیں ہے۔ادھر ادھر بہت ڈھونڈنے کے بعد آخر کار وہ پولیس اسٹیشن کا رخ کرتا ہے۔پولیس اسٹیشن میں اپنی گمشدہ بیوی کی رپورٹ درج کرواتا ہے۔پولیس والے اس کی بیوی کا حلیہ اس

سے پوچھتے ہیں کہ اس کی بیوی کیسی ہے۔ اس نے کون سے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ لیکن اسے اپنی بیوی کا حلیہ تک یاد نہیں ہوتا۔ اس افسانہ میں مصنفہ نے مرد کی بے حسی، عورت کی جانبداری اور وفاداری کو بیان کیا ہے۔

"تو صاحب آپ پریشان نہ ہوں رپورٹ درج کر لیتے ہیں۔۔۔ اچھا تو کپڑے کس رنگ کے پہن رکھے ہیں۔۔۔؟ میں چونکا اور ایک دم پھر سناٹے میں آ گیا۔ کپڑے؟ میں نے بہت یاد کرنا چاہا۔ یہ تو میں نے دیکھا ہی نہیں رنگ؟ کون سا رنگ تھا بھلا میں نے بہت سوچا۔۔۔ کوئی رنگ کوئی لباس میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔۔۔ تو کیا میں نے اتنے عرصے اسے دیکھا ہی نہیں، نہیں میں تو اسے دیکھتا تو رہا ہوں۔۔۔ وہ محض ایک اسم تھی کام نپٹانے والی کوئی پراسرار مشین۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ضرور مجھے اس کی تفصیلات یاد رہ جاتیں۔"(۲۹)

خالدہ حسین کے افسانوں میں اہم ترین موضوع شناخت کا مسئلہ سب سے نمایاں ہے۔ شناخت کا مسئلہ فرد کی ذات ہی سے شروع ہوتا ہے۔ خارج اور داخل کی کشاکش میں پسے ہوئے مرد اور خواتین ڈپریشن، بغاوت، بے حسی وغیرہ یہ تمام عوامل اس کی پہچان چھین لیتے ہیں۔ شناخت اور گمشدگی کا مسئلہ دو طرح سے نظر آتا ہے۔ ایک داخل اور دوسرا خارج۔ اخلاقی قدروں کی زوال پذیرئی کی وجہ سے داخلی طور پر فرد بے شناخت ہو جاتا ہے۔ بے توقیری کا احساس خارجی سطح پر فرد کی شناخت چھین لیتا ہے۔ فرد کا وجود بھی اپنے آپ سے ہی انجان اور بے خبر ہو جاتا ہے کہ وہ چند لمحے پہلے کیا کر رہا تھا۔ اس کو خبر ہی نہیں ہوتی۔ مفلوج ذہن کے ساتھ معاشرتی زندگی میں خود ہی اپنے آپ کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ اس حوالے سے "دھند" کا موضوع خارجی جبر کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ "دھند" میں جس فرد نے اپنی ازدواجی زندگی کا سفر شروع کیا تھا آج بھی وہ سفر "دھند" کی نظر ہو رہا ہے۔ "دھند" میں راستے غائب ہو جاتے ہیں۔ پہچان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ خیالات، سوچ، ذہن، یقین کی عدم موجودگی سب کے سب دھند کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ دھند کے یہ عناصر آہستہ آہستہ خارج سے داخل کا سفر کرتے ہیں۔ داخل اور خارج دونوں سطحیں اس کی لپیٹ میں آ جاتی ہیں۔ فرد آج بھی دھند کی کیفیت میں دوچار نظر آتا ہے۔

"اسے دفتر سے نکل کر مارکیٹ جاناتھا۔بچوں اور بیوی کے لیے چیزیں خریدنا تھیں۔لیکن یہ دھند۔۔۔ تلاش گمشدہ میرے ذہن میں الفاظ گردش کرنے لگے اور میں نے سوچا کہ آئے گئی تو داستان سناو گا۔"(۳۰)

یہاں دھند ماحول کو جبر کے حوالے سے دھندلا رہی ہے۔خارجی جبر ہر چیز، ہر ماحول اور ہر وجود کی شناخت کو مست کر دیتی ہے۔شناخت کا موضوع خالدہ حسین کے ہاں ایک مخصوص ارتقائی کیفیت کا حامل ہے۔انسانی جذبات اور احساسات کی معاشرے کے اندر کوئی قیمت نہیں۔جدید معاشرے کے اندرافسانے کی مرکزی کردار دھند میں لپیٹے اپنی زندگی گزار رہی ہوتی ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں۔وہ سارا دن ایک مشین کی طرح مختلف امور مختلف وقتوں میں انجام دیتی ہے۔لیکن اس کے باوجود کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

جدید سماج کے تناظر میں دیکھا جائے تو وسائل بڑھ جانے کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔عائلی زندگی میں جھگڑے کی ایک اہم وجہ وسائل کا ضرورت سے زیادہ ہونا بھی ہے۔افسانے کی مرکزی کردار صحیح اور غلط کی کشمکش میں مبتلا ہوتی ہے۔بے بسی اور مایوسی کی فضا "دشمن" میں پائی جاتی ہے۔اس افسانے کی مرکزی کردار دن کے کاموں سے تھک کر اپنے وجود کو گھپ اندھیرے میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہے۔اس کی آنکھوں اور کانوں میں یہ اندھیرا اٹک جاتا ہے۔یہاں تک کہ اس کے دل کے اندر بھی بہتر وسائل کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

(د) جدید زندگی میں معاش جنس اور شناخت کے مسائل:

جاگیر درانہ اور سرمایہ درانہ نظاموں کی عمارت استحصال کی بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہے۔جہاں مجبور اور بے بس انسانوں کو ان کے حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔جدید معاشرے کے اندر ایک اہم مسئلہ معاش، جنس اور شناخت کا بھی ہے۔اس کی عکاسی خالدہ حسین نے اپنے افسانوں "دشمن"، "عجائب گھر"، "کفل ابجد"، "کان"، "مصروف عورت"، "الساعت"، "جو کچھ جیسا ہے جہاں ہے"، "تریاق" اور "شہر پناہ" میں کی ہے۔جدید زندگی میں عورت معاش کی تلاش کی غرض سے اپنے وجود تک کو مٹا دیتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی اس کو شکوک وشبہات کی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔افسانہ "دشمن" کی مرکزی کردار اپنے بچوں، شوہر اور گھر کے لیے دن رات کاموں میں مصروف رہتی ہے۔اس کو اپنی ذات کے حوالے سے بھی وقت نہیں ملتا۔ان تمام کے

باوجود بھی اس سے پوچھ گوچھ کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔

"میں ایک مصروف عورت ہوں۔ جس کے پاس پیسے کی فراوانی نہیں ہے۔ جو رات کو دن بھر کے کاموں سے تھک ہار کر بستر میں لیٹتی ہے۔ جس کے دل میں زندگی کے بہتر وسائل کی خواہش ہے۔ دوستوں کے مسائل، ان کے دکھ درد، بچوں کے مستقبل کے ادھورے بے کار منصوبوں کی بھر مار۔ پھر مجھ سے کیوں پوچھا جاتا ہے۔ ہر لمحے مجھ سے پوچھا جاتا ہے۔ باقی سب سے ہر ایک سے کیوں نہیں پوچھا جاتا وہ جو زندگی کے سمندر میں مزے سے بہ چلے جاتے ہیں۔ ہر قدم اٹھانے سے پہلے ان کے سامنے فیصلے کی سلیپ نہیں آن کھڑی ہوتی۔ کوئی سوچ سوچنے سے پہلے ان کو جواب دہ نہیں ہونا پڑتا۔"(۳۱)

جدید سماجی تناظر کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس دور کے اندر نسائیت کو آزادی اظہار کے مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی لکھنا چاہے تو اس کو پذیرائی بھی نہیں ملتی۔ عورت کی چونکہ سماجی حیثیت بھی اتنی مضبوط نہیں ہے کہ وہ اپنے لکھے ہوئے کا لوہا منوا سکے۔ انہیں کہیں نہ کہیں معاشرتی دباؤ کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اپنی حکمت عملی کی وجہ سے اگر اپنا ایک مقام بنانے میں کامیاب ہو بھی جائے تو معاشرہ ایسی عورتوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ افسانے کی مرکزی کردار بہت سی کہانیاں لکھنا چاہتی ہے لیکن اس کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ وہ کھل کر اس پر کوئی کتاب لکھ سکے۔ کیونکہ معاشرے کے اندر صرف ان ہی کتابوں کو پذیرائی ملتی ہے جو کسی کی تعریف و تحسین کے حق میں لکھی گئی ہوں۔

"پیسے نہیں ہیں اور یہ معمولی گھر۔ اس نے اب چاروں طرف نگاہ ڈالی اور کتنی بے شمار چیزوں کی خواہش ہے تمہارے دل میں اور دولت کی طاقت سے بھی تم واقف ہو۔ تو پھر یہ سرکٹی شہزادی کہاں سے آگئی؟ تمہیں افلاس، استحصال کی کہانی لکھنی چاہیے۔"(۳۲)

آزادی کے مسائل جدید دور کے اندر بہت زیادہ ہیں۔ لکھنے اور لکھانے کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی میوزیکل گروپ کی ہے۔ جدید معاشرے کے اندر ایک لکھاری اور ادیب کو اتنی پذیرائی نہیں ملتی۔ حالانکہ ادیب

معاشرے کا بہت ہی احساس فرد ہوتا ہے۔افسانے کی مرکزی کردار بھی اپنا ایک وقت نکال کر کتابیں لکھتی ہے۔موت اور تنہائی کی باتیں اور لایعنیت کی عکاسی تحریری صورت میں کرتی ہے۔اسی کی عکاسی خالدہ حسین نے اپنے افسانے "عجائب گھر" میں یوں کی ہے:

> "ارے یہ تو وہی کچھ کرنے لگا جو میں کرتا تھا۔۔۔کہانی لکھتا ہے،ناول لکھے گا، نظمیں لکھے گا اور وہی کچھ لکھتا ہے جو میں لکھتا ہوں۔۔۔موت اور تنہائی کی باتیں اور لایعنیت اور اجنبیت کا قصہ۔۔۔ہزاروں روپے جیب ٹھوستا ہے۔ہر مہینے کتنا کہاں کہ میوزیکل گروپ بنالو مگر یہ چلا رئیٹر بننے۔"(۳۳)

خالدہ حسین نے پڑھی لکھی عورتوں کے مسائل کو عصری شعور کے ساتھ بڑے دانشورانہ انداز میں پیش کیا ہے۔جدید معاشرے کی عورت دکھ درد اور کرب کو دور کرنا چاہتی ہے۔وہ چاہتی ہے کہ آج کی عورت عصری تقاضوں کو سمجھ کر معاشرے میں اپنی شناخت اور مقام کو تسلیم کروائے۔آج بھی عورت کے حوالے سے یہ تصور عام ہے کہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک اکیلے سفر نہیں کر سکتی۔کیونکہ آج بھی عورت کو بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔دور جدید میں کوئی بھی ادیبہ کسی غیر ملکی کانفرس میں اکیلے شرکت کرنے کے لیے نہیں جاتی۔خالدہ حسین کا افسانہ "کفل ابجد" اسی تناظر کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔غیر ملکی ادبی کانفرس میں شرکت کے لیے جانے والی ادیبہ کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔پہلے تو وہ خود ہی فیصلہ نہیں کر پا رہی ہوتی کہ اسے جانا چاہیے کہ نہیں۔حالانکہ ملک کے اندر اس نے بہت سی ادبی کانفرس میں شرکت کی ہوتی ہے۔لیکن جب سے اسے بیرون ملک کانفرس میں شرکت کرنا پڑتی ہے تو وہ سوچ بچار میں مبتلا رہتی ہے کہ وہ جائے یا نہیں۔

> "چنانچہ اتنی بہت سی عمر گزر جانے کے باوجود یہ فیصلہ نہ کر پا رہی تھی کہ وہ اس دور پار کے سفر پر جانا چاہتی ہے یا نہیں۔مگر صبح ہوتے ہی وہ اس خیال سے چل پڑی کہ نہ جانے کی صورت میں اسے کسی پچھتاوے کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"(۳۴)

ادیبہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک گروہ کے ساتھ دوسرے ملک ادبی کانفرس میں شرکت کے لیے روانہ ہو جاتی ہے۔لیکن جب وہ وہاں پہنچتی ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی اجنبی دنیا میں آگئی ہے۔

"دانش وروں کے جگھٹے ،مترجموں کی سر گوشیاں ،وقفوں کو بھرنے والی مصنوعی مسکراہٹیں ،سروں کی جنبش اور آخر میں ملاقاتیں۔۔۔دوسرے شہر میں ایک ایک اجلاس اور۔۔یہ اکیلے سفر نہیں کر سکتی گم ہو جائے گی۔ٹرین اسٹیشن میں صرف پانچ منٹ رکتی ہے۔اسے یہاں کی زبان بھی بالکل نہیں آتی۔"(۳۵)

خالدہ حسین نے بڑے دانشورانہ انداز میں پڑھی لکھی ادیبوں کے مسائل کو اجاگر کیا ہے کہ بیرون ملک جانے والی ادیبہ اور دانشوروں کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔غیر ملکی زبان نہ آنے کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔جس طرح افسانے کی مرکزی کردار کے ساتھ ہوا۔وہ بیرون ملک پہنچ جاتی ہے تو اسے وہاں جاکے پتا چلتا ہے کہ اس کے پاسپورٹ اور ویزہ کی تاریخ ختم ہونے والی ہے۔وہ اپنی بات ان افسران کو سمجھانا چاہتی ہے لیکن کوئی بھی اس کی زبان کو نہیں سمجھ پا رہا ہوتا۔سفر کے دوران ہی اس کا پاسپورٹ گم ہو جاتا ہے۔تفتیشی افسران جب اس سے اس کا پاسپورٹ مانگتے ہیں تو اس کے پاس پاسپورٹ بھی نہیں ہوتا۔وہ بہت پریشان ہو جاتی ہے:

"اجلاس؟عورت واقعی ہی حیران رہ گئی۔ان حالات میں؟جب کہ آپ کے پاس نہ تو پاسپورٹ ہے اور ویزہ بھی ختم ہو چکا ہے۔بقول آپ کے آپ کی ساری کرنسی وہیں کہیں ریلوے ٹریک میں گر گئی ہے۔مجھے ڈر ہے جب تک سارا معاملہ صاف نہیں ہو جاتا۔آپ کو کہیں اور ٹھہرنا پڑے گا۔۔۔مت بھولیے میں آپ کی سرکاری مہمان ہوں۔سرکاری۔مرد نے قدر تلخی سے کہا۔"(۳۶)

دیارِ غیر جانے والی یہ ادیبہ جب اپنا پاسپورٹ، کرنسی نوٹ اور پہچان والوں کے نام سب گم کر دیتی ہے تو اس کے وجود کی اہمیت بھی ان چیزوں کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔بیرون ملک سفر کرنے والی ادیبہ کی حیثیت کاغذ کے ٹکڑوں کی وجہ سے تھی۔جب کاغذ کے ٹکڑے گم ہو گئے تو اس کے وجود کی اہمیت کا بھی خاتمہ ہوا۔خالدہ حسین نے افسانہ "کفل ابجد" کے ذریعے یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ جدید دور کے اندر وجود کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔اہمیت صرف کاغذ کے ٹکڑوں کی ہے۔انسانی وجود کی شناخت بھی صرف کاغذ کے ٹکڑوں کی مدد سے کی جاتی ہے۔دانشوروں اور ادیبوں کو بعض اوقات ایسے ہی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

افسانہ "کان" میں خالدہ حسین نے تخلیق کاروں اور فنکاروں کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔فنکار اور تخلیق

کار بھی ذہنی اذیت سے دوچار نظر آتے ہیں۔ خالدہ حسین نے "کان" افسانے میں خواتین لکھاریوں کو درپیش مسائل کی عکاسی کی ہے۔ ایک تخلیق کار عورت کے لیے لکھنا انتہائی مشکل کام ہے ۔جو معاشرے کے احساس ترین موضوعات پر لکھتی ہے۔ لیکن جب اس کو ایک کانفرس میں شرکت کے لیے بلایا جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے کاموں کو بہت سراہتی ہے۔ لیکن جب اس کے کام کے حوالے سے پوچھا جاتا ہے تو وہ اپنے نام کے اوپر ہاتھ رکھ لیتی ہے۔ خالدہ حسین نے ذہنی اذیت سے دوچار خواتین لکھاریوں کی عکاسی کی ہے کہ جدید معاشرے کے اندر بہت سی ایسی خواتین بھی ہیں جو بہت عمدگی کے ساتھ لکھتی ہیں۔ لیکن معاشرے کے طنز و مزاح کے رویے کی وجہ سے اپنے آپ کو چھپا لیتی ہے۔ وہ ظاہر ہی نہیں کرنا چاہتی کہ ان کے اندر بھی ایک ہنر موجود ہے۔ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو کہیں چھپا لیتی ہیں جس کی وجہ سے معاشرہ دانشورانہ ادیب سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

> "یہاں کی خواتین بے حد باشعور ہیں۔ وفد میں سے ایک نے اظہار خیال کیا۔۔۔ مجھے ہر صورت میں ان ادیبوں سے ملنا ہے۔ غیر ملکی دانشور نے اپنی ڈائری کی فہرست میرے سامنے رکھ دی۔ یہ کہاں اور کس طرح مل سکتے ہیں، میں نے فہرست پر نظر ڈالی۔ یہ درجہ دوم کی شئے بڑھک کر درجہ اول میں آن رہی ہے۔ میں نے اپنے نام پر انگلی رکھ دی۔ باقی سب یہاں موجود ہیں۔ میں نے آہستہ آہستہ سب کے بارے میں بتانا شروع کیا۔"(۳۷)

خالدہ حسین کہتی ہیں کہ معاشرے کے اندر بہت سی خواتین باشعور ہیں۔ لیکن معاشرے کے اندر لوگوں کا طنزیہ رویہ بھی ان کو آگے آنے سے روک دیتا ہے۔ جدید معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ کسی کی صلاحیتوں کو سہرایا نہیں جاتا بلکہ طنز کا نشانہ بنا کر اس کی صلاحیتوں کو دبا دیا جاتا ہے:

> "اس وقت استقبالیہ میں سب مشروبات تھا۔ تین تین چار چار گروہوں میں بٹے آپس میں مہذب لوگ سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ اچھا تو خیر سے تم بھی؟ مجھے دیکھتے ہی۔۔۔"(۳۸)

خالدہ حسین نے دانش ورانہ انداز میں پڑھی لکھی عورتوں کے مسائل کو عصری شعور کے ساتھ ملا کر پیش کیا ہے۔ جدید معاشرے کے اندر عورت پر دوہری ذمہ داری عائد کر دی جاتی ہے۔ عورت کے وجود سے

معاشرہ دوہری توقعات وابستہ کر لیتا ہے۔ ایک خاتون لکھاری ہونے کی وجہ سے اس کی شخصیت معاشرے کے فرد کی حیثیت سے تصادم کا شکار رہتی ہے۔ افسانہ "مصروف عورت" میں مرکزی کردار مختلف انداز میں اپنے کردار نباتی ہے۔ تخلیقی کاموں کے لیے روزمرہ کی مصروفیت میں موقع کی کھوج میں لگی رہتی ہے۔ افسانہ "مصروف عورت" خالدہ حسین کی شخصیت کا عکس ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار روزمرہ مصروفیت ہونے کے باوجود بھی اپنے تخلیقی کاموں کے لیے ایک موقع کی تلاش میں رہتی ہے۔ معاشرہ بھی تخلیق کار عورتوں سے یہ توقع وابستہ کر لیتا ہے کہ اب ان کو ایک نیا شاہکار پڑھنے کا موقع مل گیا ہے۔ خالدہ حسین کہتی ہیں کہ بے حد مصروف پیشوں کے لیے اپنے لیے وقت نکالنا اور غور و فکر کر کے کچھ تحریر کرنا نہایت مشکل ہے۔ گھر، بچے اور شوہر کی ذمہ داری کے علاوہ دیگر امور کی ذمہ داری بھی عورتوں پر عائد کر دی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے تخلیق کار عورت کے لیے مصروفیت کی فہرست میں سے اپنے لیے وقت نکالنا نہایت مشکل امر ہے۔

> "دراصل بے حد مصروف پیشوں کے لیے کام کے درمیانی وقفے سب سے زیادہ گھمبیر ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے تخلیق کاروں کے ہاں آپ کو ریاضت کے ایسے دور نظر آئیں گئے۔ ایک مفروضہ ثابت کرتے ہی انہیں یہ احساس آن لیتا ہے کہ آپ اس کے امکانات ختم ہونے اور نئے امکانات کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔۔۔ مصروف آدمی کی مصروفیت کی فہرست مرتب کرنا بالکل ممکن نہیں۔"(۳۹)

تخلیق کار عورت اور فنکار ادیبوں کے لیے کام کی فہرست اتنی طویل ہوتی ہے کہ وہ وہی کام نہیں کر سکتی جس کو اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھتی ہے۔ گھریلو ذمہ داریوں سے بیزار اور منہ بھی نہیں موڑ سکتی کیونکہ گھر میں رہنے کے لیے ان کو تمام امور کی ذمہ داری بھی نبھانی پڑتی ہے۔ اس وجہ سے وہ ایک کام سے دوسرے کام کی جانب لپکتی رہتی ہیں۔

> "میرا کوئی بھی کام وقت پر اور صحیح نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ ہر کام کے دوران مجھے کچھ اور کرنا چاہیے تھا۔ چنانچہ میں دوسرے کام کی جانب لپکتی۔ مگر آدھا کر چکنے کے بعد یہ پتا چلتا کہ

ضروری کام کرنا تو پڑا ہی رہ گیا۔ تمام دن ایک سے دوسرے، دوسرے سے پہلے کام
کی طرف لپکتا گزرتا۔"(۴۰)

خالدہ حسین نے افسانہ "مصروف عورت" میں دانشوروں اور ادیبوں کی مصروفیت کی جانب توجہ مرکوز کروائی ہے کہ تخلیق کار عورت کو اپنے تخلیقی کاموں کے ساتھ ساتھ امور خانہ داری کی ذمہ داری بھی نبھانا پڑتی ہے۔ جس کی وجہ سے سوچنے اور غور و فکر کرنے کا وقت بہت کم ملتا ہے۔ ادیبہ معاشرے کی احساس ترین فرد ہے۔ وہ معاشرے کے مسائل کو نہ صرف محسوس کرتی ہیں بلکہ ان کو مختلف صورتوں میں لا کر قارئین کے سامنے پیش کرتی ہے۔

خالدہ حسین نے افسانہ "الساعت" میں جدید معاشرے کی مصروف عورت کی جانب توجہ مرکوز کروائی ہیں۔ جس کو گھریلو امور کے ساتھ ساتھ دفتری امور انجام دینے ہوتے ہیں۔ امور خانہ کی بھی ساری ذمہ داری اسی عورت پر عائد کر دی جاتی ہے۔ جدید معاشرے کی عورت ایک مشین بن کے رہے گئی ہے ۔ دفتری امور کی انجام دہی کے بعد گھریلو امور کو بھی فراخ دلی سے انجام دینا پڑتا ہے۔

"بڑے میاں کی مت ماری گئی ہے۔ دن رات پڑے اس آرام کرسی میں سبزی کی
طرح اگتے ہیں۔ پھر کبھی اچانک ہی غیرت میں آجاتے ہیں۔۔۔ حالانکہ جانتے ہیں
کہ میں کس قدر مصروف عورت ہوں۔ کبھی ایک لمحہ فراغت کا ملتا نہیں۔ گھر، ہر
جگہ عجیب و غریب سلسلے ہیں۔"(۴۱)

خالدہ حسین کے ہاں زندگی کی بے جا ذمہ داریاں، خوف، تنہائی، یقین اور بے یقین کی اذیت یہ سب ان کی کہانیوں میں واضح نظر آتے ہیں۔ زندگی کی بے معنویت اور بے جا بوجھ کا المیہ ان کرداروں سے ہمہ وقت چپکا نظر آتا ہے۔ خالدہ حسین نے اس المیے کا بارہا اپنی ذات کے حوالے سے پیش کیا۔ ڈاکٹر اعجاز راہی کے نزدیک:

"زندگی کی بے معنویت، اقدار کی پامالی اور موت کو شعور نے جس نئے احساس کو
نمایاں کیا ہے وہ خالدہ حسین کے ہاں ارزاں ہے یہ مقام تجسس و جستجو کے نئے علائق

کرتا ہے، خالدہ حسین کے ہاں ذات میں ڈوبنے کے عمل اور ذات میں تلاش کے
عناصر ترکیبی کو ترتیب دیتا ہے۔"(۴۲)

بے جا ذمہ داریوں کے حوالے سے خالدہ حسین کے افسانوں کی عورت جدید معاشرے میں کرب اور اذیت کی صورتحال سے گزر رہی ہوتی ہیں۔ عورت کی بے بسی، مظلومیت اور لاچارگی کی مختلف تصویریں کرب اور اذیت کو گہرا کر دیتی ہیں۔

"اب میں اپنا فرض تو بالکل تفصیل اور دیانت داری کے ساتھ ادا کرتی ہوں۔ناشتہ
دونوں وقت کا کھانا، بالکل وقت پر صاف ستھری طشتری۔ چمکتے شفاف نیپکن۔ جگمگاتی
کٹلری اور نفیس خوش رنگ خوش ذائقہ کھانے، کپڑے بھی ہر وقت تیار، اخبار ہر
وقت موجود بلکہ سب سے پہلے انہی کے سرہانے دھرتی ہوں۔ رات سونے سے پہلے
دودھ کی ساتھ دوا۔ اب اس کے علاوہ اوندھی سیدھی باتیں سننے کا شرف بھی مجھ ہی
کو بخشا جانے لگا ہے۔"(۴۳)

بے جا ذمہ داریوں کے حوالے سے خالدہ حسین کے افسانوں کی عورت جدید معاشرے میں شناخت اور پہچان کے مسائل سے دوچار نظر آتی ہے۔ جدید معاشرے کی عورت اپنی ذات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تمام ذمہ داریاں نبھاتی ہے۔ شہری خواتین کے کندھوں پر دوہری ذمہ داری ہوتی ہیں۔ انھوں نے گھر گرہستی کے علاوہ بچوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ گھر کے اخراجات پورا کرنے میں مردوں کا ساتھ دینا ہوتا ہے۔ ملازمت میں اپنا مقام پیدا کرنے کے لیے زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ اس افسانے کی مرکزی کردار بھی انہی مسائل سے دوچار ہے۔

"میرے پاس دفتر کی ہزار فائل رکھی ہے۔ وہ ٹماٹروں، باروچی خانے میں آلو پیاز،
دال گوشت کی کھپت پوری کروں کہ بڑے میاں سے مکالمہ کروں۔"(۴۴)

گھر گرہستی، بچوں کی پیدائش و پرورش اور ملازمت کے دوران پیش آنے والے مسائل کے علاوہ عورتوں کو دیگر کئی طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جن کا براہ راست اثر ان کی نفسیات پر پڑتا

ہے۔ ہمارے جدید معاشرے میں لڑکیوں کی نمائش کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے گھر پر بھی گہری نظر ہوتی ہے۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانے "جو کچھ جیسا ہے، جہاں ہے" میں اس قسم کے مسائل کی جانب توجہ مرکوز کروائی ہیں۔ جس میں والدین کو اپنی بیٹیوں کی خاطر صرف ظاہری دکھاوے کی خاطر عالی شان بنگلوں میں منتقل ہونا پڑتا ہے۔

"ہاں بیٹوں کی شادی کرنا ہوں تو اپ کو اچھے سیکٹر میں رہائش اختیار کرنا ہو گی۔ اور اس کا انتظام نہایت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ یہ مکان اتنے میں تو اٹھ جائے گا کہ آپ اچھے پوش علاقے میں مکان لے سکیں۔ بنگلہ۔ ایک بنگلہ بنے نیارا۔۔۔ وہ گنگناتے اور صوفے کے بازو پر انگلیوں سے تال دینے لگی۔ میرا گلا خشک ہو گیا۔"(۴۵)

افسانہ "تریاق" میں خالدہ حسین نے عورت کی شعوری ذات کو نفسیاتی توجیحات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں سماجی روائیوں کو نفسیاتی توجیحات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خالدہ حسین نے افسانے کی مرکزی کردار کی نفسیاتی الجھنوں کا ذکر تمام تر سماجی وجوہات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ وہ نفسیاتی دباؤ کا شکار ہے۔ حالات واقعات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے شخصی رد عمل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پیدائش کے بعد افسانے کی مرکزی کردار کو اپنے ہی رشتہ داروں نے بہت دکھ دیے۔ جس کی وجہ سے اس کی شخصیت کی مناسب نشو نما نہ ہو پائی اور اس کے دل کے اندر اپنے رشتہ داروں کے لیے بہت سی نفرت بھرنے لگی۔

"یقینا ان لوگوں میں شمار ہوتی ہوں جن سے پناہ پکڑنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اکثر میں نے دیکھا ہے کہ وہ جن کو میں بزعم خود اپنے پیاروں میں شمار کرتی چلی آئی تھی ان کی راحت نے مجھے بے حد دکھ پہنچایا۔ میں نے چاہا کہ ان کی راحت غم یا کم از کم شکست اور ناکامی میں بدل جائے۔ پھر میں نے ان کے لیے بڑے بڑے مصائب تصور کیے۔ اس سے مجھے بہت سی تسکین ملی۔ مگر میں پھر بھی ان کے لیے روتی رہی۔"(۴۶)

خالدہ حسین نے جدید معاشرے کے اندر عورت کے سمجھوتے کے رویئے پر روشنی ڈالی ہے۔ بدلے کی آڑ میں عورت خود کو ہی تکلیف پہنچاتی ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار اپنے ہی رشتوں کی وجہ سے عدم توجیحی

اور ذہنی الجھاؤ کا شکار ہو گئی۔ معاشرتی پابندیوں نے اس کا حلقہ اور بھی تنگ کر دیا ہے۔ گھر والوں کی عدم توجیحی کی بنا پر افسانے کی مرکزی کردار کی حالت درست نہ رہی۔ انسان کی نفسیات پر اس کے گردونواح اور ماحول بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ ماحولیاتی جبر سے تنگ آکر اور معاشرے کی تمام تر قیود سے آزاد ہونا چاہتی ہے۔ مرکزی کردار نے اپنے نام سے بھی بیزار ہونے کا سوچ لیا کہ اگر وہ اس نام سے ہی نجات حاصل کر لے گئی تو معاشرے کے اندر تمام مسائل سے بھی اس کو نجات مل جائے گئی۔ جس کی وجہ سے وہ اپنا نام بھی دوسروں کو بتانا گوارہ نہیں کرتی۔ "شہر پناہ" میں عورت کو فطری ارتقا کے ساتھ بدلتے ترجیحات اور معیارات کے ساتھ خالدہ حسین نے پیش کیا ہے۔ جدید معاشرے کے اندر نسائیت کو اہم مسئلہ جنسی بے راہ روی کا بھی ہے۔ ڈاکٹر نازیہ یونس لکھتی ہیں:

> "جاگیر درانہ اور سرمایہ درانہ نظاموں کی عمارت استحصال کی بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہے۔ جہاں مجبور اور بے بس انسانوں کے بنیادی حقوق غصب ہو جاتے ہیں۔ ان نظاموں کے پروردہ اذہان سرمائے اور طاقت کے بل بوتے پر ناممکنات کو بھی ممکنات بناتے ہیں۔ پر عیش زندگی اور من مانی تسکین کی ہوس رکھنے والے مردوں کے ہاں عورت کی وقعت بازار کی جنس سے زیادہ نہیں ہوتی جس کی ہر روز منڈی میں بولی لگتی ہے۔ قیمت ادا ہوتی ہے اور غلام ہوتی ہے۔"(۴۷)

مرد اور عورت اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے خواہاں ہیں۔ افسانے کی مرکزی کردار "گڈو" جو "ظفر" کے ساتھ پڑھتی ہے۔ حالانکہ اس کی بہن "گڈو" کو "ظفر" سے دور رہنے کا مشورہ دیتی ہے۔ لیکن اسے کسی بھی بات کا کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن جنسیت کا شکار ہونے کے بعد "گڈو" "تو" ظفر" کے وجود سے بھی خوف کھانے لگی۔ وہ لڑکی جو ہر وقت کھیلتی کودتی رہتی تھی لیکن ظفر کے ساتھ ساتھ سب سے نفرت کرنے لگی۔ اس نے اپنے باپ کے لیے بھی دل میں شدید نفرت پیدا کر لی۔ جدید سماج کے اندر جنسیت کا مسئلہ بھی بہت زیادہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس دور کے اندر بہت سی لڑکیوں کی زندگی خراب کرنے میں "ظفر" جیسے لڑکوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے لڑکیاں نہ صرف مردوں کے وجود سے خوف کھانے لگتی ہیں بلکہ خود کو دنیا کی

کسی چیز میں بھی محفوظ نہیں سمجھتی سوائے موت کے۔

"اسے ظفر سے وہشت ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ اس وہشت نے بڑھ کر ہر چیز کو نگل لیا۔ آوازوں کا سحر ختم ہونے لگا۔ اب چھت پر قدموں کی دم دم نہ تھی۔۔۔ اچانک اس نے کمرے کی کھڑکی میں سے جھانکا تھا۔ معلوم نہیں اسے دیکھ کر اس کے جسم میں برف سی کیوں جمنے لگی اور بے نام خوف سے وہ لرزنے لگی۔۔۔ اس کا جی چاہا کہ کاش ظفر آج راہ چلتے بس سے ٹکرا جائے۔ وہ جانتا تھا ہم سب غیر محفوظ ہیں۔ کاش وہ نہ ہوتا۔ وہ سسکیاں روکے چلتی رہی۔"(۴۸)

افسانہ "شہر پناہ" میں خالدہ حسین نے جنسی مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے معاشرے کے بظاہر معزز نظر آنے والے افراد کے اصلی چہرے بے نقاب کیے ہیں۔ جدید معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ مرد عورت کو ایک کھلونا سمجھتے ہیں۔ اپنی جنسی ہوس پورا کرنے کے بعد ایک کھلونے کی طرح پھینک دیتے ہیں۔ عورت کے جذبات، احساسات کی مردانہ معاشرے میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ڈاکٹر نگہت ریحانہ لکھتی ہیں:

"خالدہ اصغر اپنے موضوعات عام زندگی سے چنتی ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں پیچیدہ سے پیچیدہ تر سچائیاں اور مسائل سر اٹھاتے ہیں۔ اسی زندگی میں جو انہونی باتیں ہوتی ہیں وہ معجزات سے کم نہیں ہوتیں۔ ان ہی سے خالدہ حسین اپنے افسانوں کا تانہ بانہ بنتی ہیں اور انہیں اپنی خام یا اصلی شکل میں پیش کر دیتی ہیں۔"(۴۹)

خالدہ حسین نے اپنے افسانوی مجموعے کے اندر نسائی مسائل کی عکاسی معاشرے کے ارد گرد ماحول کو مد نظر رکھ کر کی ہے۔ ان کی کہانیاں عصری شعور سے کما حقہ گہری فکر اور اسلوب کے امتزاج کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ خالدہ حسین کے افسانوں کی عورت غور و فکر کرنے والی اور درمیانے طبقے کی مختلف مسائل میں جکڑی ہوئی ہے۔ جو اپنی بقا کی جنگ، عدم تحفظ، نفرت اور تشکیک کا شکار ہو رہی ہے۔ اسے شناخت اور پہچان کی تلاش ہے۔ تلاش کے روح فرسا عمل میں اس کا دل و دماغ کرب، مایوسی اور بے بسی میں مبتلا

ہے۔ کیونکہ جدید معاشرے کی عورت بھی یہ جان گئی ہے کہ زمانہ قدیم کی طرح آج بھی عورت مردانہ سماج میں بے بس، اجنبی، محروم، کھلونا اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔

خالدہ حسین کا پسندیدہ موزوں ایسی ٹکڑوں میں تقسیم عورت کا آشوب ہے۔ خالدہ حسین اپنے افسانوی مجموعوں "پہچان"، "دروازہ"، "میں یہاں ہوں"، "مصروف عورت، ہیں"، "ہیں خواب میں ہنوز"، میں داخلیت اور خارجیت کے ملاپ سے افسانہ بنتی ہیں۔ جسے قاری غوروفکر کے بعد سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان کے بیشتر کردار سوالیہ نشان بن کر زندگی کے وسیع تناظر میں پھیل جاتے ہیں۔ عام زندگی سے ان کے موضوعات کا تعلق ہے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں روایتی اور جدید معاشرے کی عورتوں کے مسائل کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کروائی ہے۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم لکھتی ہیں:

> "خالدہ حسین کو دو امتیازات حاصل ہیں۔ اول یہ کہ وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے اردو افسانے میں اس وقت قدم رکھا جب اپنے آغاز میں رد قبول کی منزلوں میں تھا اور دوسرا امتیاز یہ ہے کہ جدید افسانے کو اعتبار دلانے میں جن چند لوگوں نے ایک تسلسل کے ساتھ لکھا، علامتی، اساطیری اور استعاراتی آہنگ افسانے کو دیا، ان میں خالدہ حسین کا نام نمایاں ہے۔"(۵۰)

خالدہ حسین نے اپنی تحریروں میں اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو سماجی اصولوں کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کی ہے اور ان مسائل کی جانب توجہ مبذول کروائی ہے جو بظاہر معمولی نظر آتے ہیں لیکن ان کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ خالدہ حسین اپنے افسانوں میں سچی کہانیوں کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ وہ عورت کے حقوق اور تقاضے کی علمبردار بن گئیں ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۵۵۴

۲۔ شیر محمد اختر، فرائیڈ کا نظریہ جنس، مکتبہ نفسیات۔۵۸ ٹمپل روڈ، لاہور، س۔ن، ص ۱۴

۳۔ دیش بھگت لالہ ہر دیال، مذہب اور انسانیت، میسرز لاچیت رائے اینڈ سنٹرل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۳۸ء، ص ۲۷۳

۴۔ خالدہ حسین، منی، مشمولہ پہچان، خالد پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۴۹

۵۔ ایضاً، ص ۵۱

۶۔ ایضاً، ص ۵۸

۷۔ ایضاً، ص ۵۳

۸۔ خالدہ حسین، شہر پناہ، مشمولہ پہچان، ص ۳۶

۹۔ ایضاً، ص ۳۲

۱۰۔ خالدہ حسین، مکالمہ، مشمولہ، مصروف عورت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۵۳

۱۱۔ خالدہ حسین، زمین، مشمولہ، دروازہ، خالد پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص ۶۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۵

۱۳۔ خالدہ حسین، تفتیش، مشمولہ، دروازہ، ص ۸۷

۱۴۔ خالدہ حسین، رہائی، مشمولہ، میں یہاں ہوں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵، ص ۱۳

۱۵۔ ایضاً، ص ۷۱

۱۶۔ خالدہ حسین، عجائب گھر، مشمولہ، میں یہاں ہوں، ص ۶۹

۱۷۔ ایضاً، ص ۷۱

۱۸۔ کشور ناہید، عورت خواب اور خاک کے درمیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۵۳

۱۹۔ محمد حمید شاہد، اردو افسانہ: صورت و معنیٰ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۸

۲۰۔ شمع خالد، سخن امروز (مرتب) خان ظفر افغانی، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۸ء ص ۱۷۵

۲۱۔ خالدہ حسین، نام کی کہانی، مشمولہ پہچان، ص ۵۹

۲۲۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ۲۶۲۔۲۶۳

۲۳۔ خالدہ حسین، نام کی کہانی، مشمولہ پہچان، ص ۵۹

۲۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عورت جنس اور جذبات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۲۵۰

۲۵۔ خالدہ حسین، آدھی عورت، مشمولہ، دروازہ، ص ۸۹

۲۶۔ ایضاً، ص ۹۰

۲۷۔ ایضاً، ص، ۹۰

۲۸۔ خالدہ حسین، پہچان، مشمولہ، پہچان، ص، ۱۳۲

۲۹۔ خالدہ حسین، دھند، مشمولہ، میں یہاں ہوں، ص ۴۶۔۴۷

۳۰۔ ایضاً، ص، ۴۴

۳۱۔ خالدہ حسین، دشمن، مشمولہ، دروازہ، ص ۱۱۵

۳۲۔ خالدہ حسین، عجائب گھر، مشمولہ، میں یہاں ہوں، ص ۴۷

۳۳۔ ایضاً، ص ۷۲

۳۴۔ خالدہ حسین، کفل ابجد، مشمولہ، میں یہاں ہوں، ص ۸۸

۳۵۔ ایضاً، ص ۹۰

۳۶۔ ایضاً، ص ۹۵

۳۷۔ خالدہ حسین، کان، مشمولہ، مصروف عورت، ص ۸۱

۳۸۔ ایضاً، ص ۸۷

۳۹۔ خالدہ حسین، مصروف عورت، مشمولہ، مصروف عورت،، ص ۸۶۔۸۷

۴۰۔ ایضاً، ص ۸۸

۴۱۔ خالدہ حسین، الساعت، مشمولہ، ہیں خواب میں ہنوز، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء ص ۳۵

۴۲۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر، اردو افسانے میں علامت نگاری، ریز پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۶۱

۴۳۔ خالدہ حسین، الساعت، مشمولہ، ہیں خواب میں ہنوز، ص ۳۶

۴۴۔ ایضاً، ص ۳۶

۴۵۔ خالدہ حسین، جو کچھ جیسا ہے جہاں ہے، مشمولہ، ہیں خواب میں ہنوز، ص ۶۸

۴۶۔ خالدہ حسین، تریاق، مشمولہ، دروازہ، ص ۲۳۸

۴۷۔ نازیہ یونس، ڈاکٹر، قتیل شفائی کی نظموں میں عورت کا المیہ، دریافت، شمارہ ۱۸، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ص ۱۲۲

۴۸۔ خالدہ حسین، شہر پناہ، مشمولہ، پہچان، ص ۳۸

۴۹۔ نگہت ریحانہ، ڈاکٹر، اردو مختصر فنی و تکنیکی مطالعہ ۱۹۴۷، بک وائز میاں چیمبرز ٹمپل روڈ، لاہور ۱۹۹۸ء، س ۳۴۴

۵۰۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی، اسلام آباد ۲۰۰۷ء، ص ۴۱۳

باب چہارم

ماحصل

الف) مجموعی جائزہ

خالدہ حسین کو تخلیق کی دیوی کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ انہوں نے جس بالغ نظری اور عصری شعور سے اپنے افسانوں میں عورت کے مسائل کو پیش کیا، اس کی تکنیکی سطح بلند ہی نہیں کی بلکہ وہ افسانے معنویت کے نئے در بھی کھولتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں عورت کی شخصیت کی تلاش کی گم شدگی نظر آتی ہے۔ بے حس معاشرہ عورت کو کھلونا سمجھتا ہے۔ اس کی حیثیت شے سے زیادہ نہیں ہے۔ جب ضرورت ختم ہوئی اٹھا کر پھینک دیا۔ خالدہ حسین وہ افسانہ نگار نہیں جو خارجی، نوکیلے اور کھردرے حصّوں اور بے رحم نشانوں پر سر پھوڑ لینے کو تخلیقیت گردانتے ہیں۔ مادی تفہیم سے آگے نکل کر ان کا معاملہ زندگی کے ہر مظہر، ہر واقعے اور ہر بات پر دستک دیتا ہے۔ یہ دستک تب تک جاری رہتی ہے جب تک معنویت ظاہر ہو کر واقعات کے ذریعے سامنے نہ آجائے اور یہی معنویت بھری دستک انہیں نسائیت پر لکھنے پر مجبور کرتی رہی ہے۔ ان کی کہانی کا سلسلہ ان کے نسائی رویے کا عکاس ہے۔ گو کہ اس کا موضوع نسائیت نہیں مگر نسائی رویہ صاف نظر آتا ہے۔ خاص طور پر جب ان کی کہانیوں میں عورت کہتی ہے "صرف میں ہی کیوں" یہ جہاں نفسیاتی تجربے کے حوالے سے آتی ہے وہیں عورت کی مظلومیت اور بے بسی کی وہ کیفیت بھی ہے کہ وہ اس اذیت کا شکار کیوں ہے۔ یہ نسائیت سے میل کھاتا ہے۔ خالدہ حسین جدید دور کی نمائندہ افسانہ نگار خواتین میں شمار کی جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۸۱ء کے بعد کیا جب ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "پہچان" کے نام سے چھپ کر سامنے آیا۔

پہلا مجموعہ "پہچان" ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ جبکہ دوسرے مجموعے "دروازہ" کے بعد ان کو افسانے کے افق پر مقام ملا۔ اس کے علاوہ تیسرا افسانوی مجموعہ "مصروف عورت ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۹۵ء میں

چوتھا افسانوی مجموعہ "ہیں خواب میں ہنوز" کے نام سے شائع ہوا۔اور پانچواں افسانوی مجموعہ "میں یہاں ہوں" ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آیا۔ان کی کہانی کا سلسلہ ان کے نسائی رویے کا عکاس ہے۔

"مصروف عورت" اہم مجموعہ ہے جو ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ مجموعے کے نام ہی سے ان کے کام میں نسائی رویے کا اظہار واضح ہوتا ہے۔ جس میں وہ عورت کے گھریلو مسائل، سماجی، نفسیاتی اور معاشی مسائل کو یکساں اہمیت دیتی ہے۔ عورت کے کرب کو کھل کر بیان کرنا اور مکمل انسان کے طور پر اس کا نفسیاتی تجزیہ کرنے میں وہ طاق ہیں۔

نسائیت کا رویہ ان کے افسانوں میں غالب نظر آتا ہے۔عورت کے کردار کے ریشے ریشے علیحدہ کرنا اور خانگی معاملات، سماج، معیشت سے جوڑ کر عورتوں کا نفسیاتی تجزیہ کرنا ان کا کمال ہے۔افسانہ "نام کی کہانی" میں خالدہ حسین نے عائلی زندگی کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔افسانہ "مصروف عورت" میں ایک ایسی عورت کی عکاسی کی ہے جس پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔یہ سب ان کا ذاتی تجربہ بھی محسوس ہوتا ہے۔اس کیفیت سے جیسے وہ خود بھی دوچار ہوئی ہوں۔یہی ان کا مشاہدہ بھی ہے اور افسانے پڑھنے والوں کو کرداروں کی گہرائیوں تک پہنچنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔جیسے ان کے افسانہ "گنگ شہزادی" ہے۔جس میں انہوں نے ایک ایسی لڑکی کی کیفیت کو بیان کیا ہے جس کو سماج کے اندر گونگی سمجھا جاتا ہے۔اور اس کی خداداد صلاحیتوں کو نکھارنے کی بجائے دبا دیا جاتا ہے۔یہ مردوں کی وہ خاص سوچ ہے جہاں بیٹیاں صرف گھروں کی چار دیواری کے اندر قید ہو کر زندگی بسر کرتی ہیں۔خالدہ حسین کے افسانوں میں عورت دبی دبی اور گھٹی گھٹی دیکھائی دیتی ہے ۔جو کسی بھی نئی تبدیلی کو قبول کرنے پر تیار نہیں اور احتجاج کرنے پر بھی قاصر ہے۔مثلاً افسانہ "ڈولی" کو پڑھ کر لگتا ہے کہ وہ شادی کو غلامی اور ذمہ داریوں سے بھرا ہوا بندھن سمجھتی ہیں۔اور اس سے بھاگنے کی بھی ناکام کوشش کرتی ہے اور یہاں ان کے آزاد ہونے کی خواہش نسائی رنگ لیے ہوئے ہے۔

خالدہ حسین کا تعلق لاہور کے بارسوخ گھرانے سے ہے ۔ اس کے باوجود وہ بے بس اور مظلوم

عورتوں کی ہمدرد ہیں۔ عورتوں کے دکھوں کا مداوا کہانیاں لکھ کر کرتی ہے۔ زندگی کی اذیتوں اور ذلتوں میں کچلی ہوئی خواتین ان کی کہانیوں کے خاص کردار ہیں۔ انھوں نے روایتی اور جدید معاشرے سے تعلق رکھنے والی عورتوں کا بغور مشاہدہ کیا ہے۔ خالدہ حسین نے جاگیر دار، خانہ بدوش، پڑھے لکھے یا ملازمت پیشہ غرض سبھی خواتین کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ انھوں نے رومانیت کے بجائے حقیقت نگاری کو اپنایا ہے۔ ان کے کردار حقیقی زندگی کے عکاس ہیں۔ انہیں زبان و بیان پر کامل عبور ہے۔ دیہاتی ماحول سے متعلق کہانیاں پڑھتے وقت قارئین کو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ان کرداروں کے درمیان خود بیٹھا ہے۔

خالدہ حسین کے پانچویں افسانوی مجموعے کے بیشتر کردار روایتی اور جدید معاشرے کی ظلم و ستم کی چکی میں پسنے والے کردار ہیں۔ ان کے بیشتر موضوعات دیہاتی طرز معاشرت، رہن سہن، طبقاتی نظام، تمدنی عادات، رسوم ورواج، توہم پرستی، معاش، جنس اور شناخت کے مسائل کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ خالدہ حسین نے روایتی اور جدید معاشرے کے نظام کی خرابیاں اپنے افسانوں میں بیان کی ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوی موضوعات کے ذریعے مردانہ رویوں کا جس طرح پوسٹ مارٹم کیا ہے وہ ان کے بے باک اور جرت مند کہانی کار ہونے کی واضح دلیل ہے۔

ان کا افسانہ "سسٹم" سماجی تشکیل کی بے باق تصویر کشی کرتا ہے۔ انہوں نے جبر واستبدا کی چکی میں پسی خواتین کی حالت زار کو بڑے ہمدردانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں کے موضوعات منفرد ہیں۔ انھوں نے بیشتر موضوعات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ روایتی اور جدید معاشرے کے تمام مسائل ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

روایتی اور جدید سماج کے تناظر میں خالدہ حسین نے اپنے افسانوں میں عورت کو موضوع بنایا ہے۔ ایک عورت کی کہانی عورت کی زبانی ہو تو کمی پیشی کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ خالدہ حسین کی عورت مظلوم، بے کس اور غریب ہونے کے ساتھ ساتھ بہادر بھی دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے ہر قسم کی عورت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ چاہے دیہی معاشرے کی لاچار، بے بس اور مظلوم ہو، چاہے شہر کی تعلیم یافتہ

اور حالات سے نبرد آزما۔ وہ عورت کو اس کے تمام تر تہذیبی پس منظر کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔

خالدہ حسین کا مشاہدہ ہمہ جہت ہے۔ روایتی سے روایت شکن تک ہر قسم کی عورت ان کی تحریروں میں جلوہ گر ہے۔ دونوں کا دکھ مردانہ سماج میں یکساں ہے۔ خالدہ حسین کی عورت ظلم اور جبر کی چکی میں پستی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مسائل سے دوچار ہونے کے باوجود بھی حالات سے لڑنے کی ٹھان لیتی ہے۔ خاص ثقافتی مزاج رکھنے اور ایک سماجی حقیقت نگار ہونے کی بنا پر ان کے افسانوں کے کردار حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ سماج کے اندر عورتوں کو ابتدا ہی سے مسائل کا سامنا رہا ہے۔ روایتی سماج میں مختلف قسم کی پابندیاں عورتوں پر عائد کر دی جاتی ہیں۔ وہ غیر مساویانہ رویہ، جنسی جبر اور قانونی عدم تحفظ وغیرہ کا شکار رہتی ہیں۔ اس طرح ایک اہم مسئلہ نسائی تشخص کا بھی ہے جس کے باعث وہ نت نئے مسائل کا شکار رہتی ہیں۔

خالدہ حسین فیمنسٹ ہیں۔ نسائیت عورتوں کے خیالات اور احساسات کا احاطہ کرتی ہے۔ گھریلو پرورش اور ماحولیاتی جبر کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کو اجاگر کرتی ہے۔ ان کے ہاں ان عورتوں کے مختلف روپ پیش کرنے کا رجحان غالب ہے جو مردوں کے ہاتھوں استحصال کا شکار ہیں۔ ان کے ہاں عورت مکمل طور پر مردوں کے جبر کا شکار ہے۔ خالدہ حسین کے ہاں عورت منفی رول میں دکھائی نہیں دیتی۔ عورت کے منفی کردار ساس اور بہو وغیرہ ان کے افسانوں میں دکھائی نہیں دیتے۔

خالدہ حسین کے پانچویں مجموعے میں ایسے نسائی کرداروں کو پیش کیا گیا ہے جن کا مردانہ معاشرے میں استحصال ہوتا ہے۔ خالدہ حسین کے ہاں عورت روایتوں کی زنجیر میں جکڑی ہوئی اور پسی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ روایتوں سے بغاوت کی کوشش کا رجحان بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ گاؤں کی خواتین کا تعلق خانہ بدوش طبقے سے ہے۔ روایتی اور جدید معاشرے میں درس و تدریس سے وابستہ پیشے کو ہی عورت کے لیے محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس پیشے سے منسلک خواتین بھی مردانہ جبر سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔ کہیں اس کی کمائی شادی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے اور کہیں اس کمائی کی وجہ سے وہ لوگوں کے فریب کا شکار ہو جاتی ہے۔

خالدہ حسین کی کردار نگاری غیر معمولی ہے۔ کردار کا تہذیبی پس منظر کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی پیش کش فطری اور حقیقی ہے۔ ان کا اسلوب اتنا دلکش ہے کہ ایسا کردار صرف خالدہ حسین ہی تخلیق کر سکتی ہیں۔ کرداروں کے مکالمے اتنے زندہ ہیں کہ ان کے تمام کردار حقیقی محسوس ہوتے ہیں۔

ب) تحقیقی نتائج

زیر تحقیق مقالے میں خالدہ حسین کے پانچ افسانوی مجموعے شامل کیے گئے ہیں۔ اس میں موجود نسائیت کے مسائل روایتی اور جدید معاشرے کے حوالے سے قدرے تفصیلاً جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۱۹۸۱ء سے ۲۰۰۵ء تک ان کے پانچ افسانوی مجموعے شائع ہوئے جنہیں اس مقالے میں دورانِ تحقیق شامل کیا گیا۔ تحقیق سے جو نتائج حاصل ہوئے وہ حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ خالدہ حسین نسائی مسائل کو منفرد انداز میں پیش کرتی ہیں۔ گویا کہ یہ تمام مسائل اسی معاشرے کے گرد گھوم رہے ہوتے ہیں۔ روایتی حوالے سے ان کے افسانے دہان زخم، یار من بیاہ، ڈولی، نامہ بر، چوبارہ، والعصر وغیرہ اہم ہیں۔ شہری تناظر میں شہر پناہ، منی، نام کی کہانی، مصروف عورت، مکالمہ وغیرہ اہم ہے۔

۲۔ خالدہ حسین کے زیادہ تر افسانے روایتی سماج میں نسائی مسائل کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ ان کا ہر کردار کہانی کے آخر میں جا کر اپنی شخصیت کھو دیتا ہے۔ مثلاً افسانہ "یار من بیاہ" میں توکل اور رضاے الٰہی پر یقین کر کے ایک عورت کو ایسے دنگل میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں سے واپسی ناممکن ہے وہ اپنی زندگی گھٹ گھٹ کر گزار دیتی ہے۔

۳۔ روایتی اور جدید معاشرے کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان کے نسائی کردار زیادہ جاندار ہیں۔ جدید معاشرے میں طاقت اور دولت کے علمبرداروں کو معاشرے نے ایک ایسی سطح پر لا کھڑا کیا ہے کہ جہاں نسائیت بہت سے مسائل سے دوچار ہے۔ سنجیدہ قارئین جب بھی ان افسانوں کو پڑھتے ہیں تو ان کے دل میں بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش کچھ ایسا ہو جائے کہ خواتین ایسے مردوں کی بھینٹ چڑھنے سے بچ جائیں۔

۴۔ خالدہ حسین حقیقت نگار ہیں۔وہ عورت کی کمزور سماجی حیثیت اور قوت کو بیک وقت بیان کرتی ہیں۔ان کے ہاں عورت کی کمزور حیثیت کے پیچھے شناخت کے مسائل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔روایتی اور جدید معاشرے کے اندر عورتوں کو نسائی تشخص کے مسائل درپیش ہیں۔خالدہ حسین کے نسائی کرداروں کی گفتگو،ان کی عمر، شخصیت اور حیثیت کے مطابق ہوتی ہے۔ان کی تحریروں میں کسی قسم کا جھول محسوس نہیں ہوتا۔یوں لگتا ہے کہ وہ روح کی گہرائیوں سے مخاطب ہیں۔

۵۔ خالدہ حسین نے روایتی اور جدید معاشرے پر جابجا طنز کیا ہے۔بناوٹی معاشرے میں عورتوں کے ساتھ ناروا سلوک پر طنز کی کاٹ لاجواب ہے۔۔ان کا طنز روایتی اور جدید معاشرے کے افراد اور اداروں پر ہے۔جس میں عورت کی بے بسی،لاچارگی اور مایوسی کی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔جدید معاشرے کی عورت شعور رکھنے کے باوجود بھی مختلف مسائل میں جکڑی دکھائی دیتی ہے۔

ج) سفارشات

۱۔ خالدہ حسین کا شمار اردو کے قد آور ادیبوں میں ہوتا ہے۔وہ ایک باریک بین تخلیق کار ہیں۔انہوں نے وہ کچھ دیکھا جو کم کم لوگوں کو نظر آتا ہے۔ان کے افسانے ہمہ جہت مطالعہ کا تقاضا کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں مذکور بالا دست طبقے کی نفسیات اور طریقہ واردات کا نفسیاتی مطالعہ خاصی دلچسپی کا حامل ہو سکتا ہے۔

۲۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانوں میں دیہی اور شہری زندگی کو بیان کیا ہے۔پنجاب کی ثقافت اور روایتی معاشرے میں درپیش عورتوں کے مسائل ان کے افسانوں کا خاص موضوع ہے۔اس حوالے سے ان کا تقابل عصمت چغتائی، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور، انتظار حسین، ڈاکٹر رشید امجد کے افسانوں کے ساتھ کیا جائے تو کافی عمدہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

۳۔ نسائی تناظر میں خدیجہ مستور کے منتخب افسانوں کا خالدہ حسین کے منتخب افسانوں کے ساتھ تقابل کیا جا سکتا ہے۔کیونکہ خدیجہ مستور کی عورت بھی معاشی مجبوریوں، مرد کی ہوس ناکی کے ہاتھوں تباہ شدہ اور

برے حالات میں بھی زندگی گزارنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ خالدہ حسین کے افسانوں کی عورت بھی ایسے مسائل اور حالات کی نمائندگی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

۴۔ خالدہ حسین کے اکثر افسانوں میں عورت کی شخصیت اور شناخت کی گمشدگی نظر آتی ہے۔اس حوالے سے تحقیق کی ضرورت ہے۔

۵۔خالدہ حسین کا اسلوب غیر معمولی ہے۔انہوں نے بے بس عورت کی آواز کو جس بے باقی اور قادر الکلامی سے پیش کیا ہے اس کا لسانی حوالے سے مطالعہ یقیناً دلچسپی کا حامل ہو گا۔

کتابیات

بنیادی ماخذ

خالدہ حسین، پہچان، خالد پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۱ء

خالدہ حسین، دروازہ، خالد پبلی کیشنز کراچی، ۱۹۸۴ء

خالدہ حسین، مصروف عورت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء

خالدہ حسین، ہیں خواب میں ہنوز، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء

خالدہ حسین، میں یہاں ہوں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء

ثانوی ماخذ

ابو الاعجاز راہی، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور علامت نگاری، ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

اصغر عباس، پروفیسر، سرسید تحریک کی نسائی حسیت، اردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ (مضمون)، مرتبہ قیصر جہاں، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۰۶ء

اکبر ایس احمد، پاکستانی معاشرہ جنوبی ایشیا میں اسلام نسل پرستی اور قیادت، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۸ء

انتظار حسین، علامتوں کا زوال، خالدہ حسین کی پہچان (مضمون)، مکتبہ نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

انوار احمد، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، علامہ اقبال یونیورسٹی، اسلام آباد ۱۹۹۶ء

ایم سلطانہ بجش، ڈاکٹر، پاکستانی اہل قلم خواتین ایک ادبی جائزہ، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۳ء

بی بی امینہ، خالدہ حسین شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۷ء

بادشاہ منیر بخاری، اردو ادب میں عورت کا تصور (مضمون) مشمولہ، ادب کی نسائی ردِ تشکیل، مرتبہ، فہمیدہ ریاض، ۲۰۰۶ء

تنویر انجم، نسائی تحریک کا ارتقاء (مضمون) مشمولہ، تانیثیت اور ادب، مرتبہ انور پاشا، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی، س۔ن

تنویر انجم، عصمت چغتائی کا نسائی شعور (مضمون)، مشمولہ، فیمنزم اور ہم ادب کی گواہی، مرتبہ، فاطمہ

حسن، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء
حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو افسانے کی روایت، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء
حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، جدید اردو فکشن عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات، شرکت پرس، لاہور، ۲۰۱۰ء
حمیدہ معین رضوی، تخلیقی تنقید، کاروان ملت پبلی کیشنز، اسلام آباد، س۔ن،
حمیرہ سعید، ڈاکٹر، اردو ناولوں میں نسائی حسیت، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی، ۲۰۰۹ء
خاور نقوی، پوٹھوار میں اردو افسانہ نگاری، کاشف بک ڈپو، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء
خالد علوی، ڈاکٹر، اسلام کا معاشرتی نظام، الفیصل ناشران تاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۵ء
دیش بھگت لالہ ہر دیال، مذہب اور انسانیت، میسرز لاجپت رائے اینڈ سنز پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۳۸ء
زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں، بک پوائینٹ باردوم، کراچی، ۲۰۰۱ء
زینت افشاں، ڈاکٹر، اردو فکشن پر سقوطِ ڈھاکہ کے اثرات، ادارہ یادگارِ غالب، کراچی ۲۰۱۶ء
رشید امجد، ڈاکٹر، رویے اور شناختیں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء
سید جلال الدین انصر عمری، عورت اسلامی معاشرے میں، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹیڈ، لاہور، ۱۹۶۲ء
سیما صغیر، ڈاکٹر، تانیثیت اور اردو ادب روایت مسائل اور امکانات، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۸ء
سید حسین محمد جعفر، ڈاکٹر، مرتبین، پاکستانی معاشرہ اور ادب، پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ، کراچی، ۱۹۸۷ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب ۱۹۹۴ حصۂ ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۴ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستان شاعرات تخلیقی خدوخال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۸ء
سلیم اختر ڈاکٹر، عورت جنس اور جذبات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء
شاہدہ حسن، نسائی حیثیت کا اظہار اور شعری پیرائے، (مضمون) مشمولہ، فیمنزم اور ہم ادب کی گواہی، مرتبہ، فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵ء
شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکیں اور رجحانات کے تناظر میں، پورب اکادمی، اسلام آباد ۲۰۰۸ء
شمع خالد، سخن امروز (مرتب) خان ظفر افغانی، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۴ء
شیر محمد اختر، فرائیڈ کا نظریہ جنس، مکتبہ نفسیات ۵۸ ٹمپل روڈ، لاہور، س۔ن
صغرا مہدی، اردو ناولوں میں عورتوں کی سماجی حیثیت، سجاد پبلیشنگ ہاوس نئی دہلی، ۲۰۰۲ء
عصمت چغتائی، ڈاکٹر، نسائی شعور کی تاریخ اردو افسانہ عورت، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء

عظمیٰ فرمان، ڈاکٹر، نسائیت (مضمون)، مشمولہ، اردو ادب اور تانیثیت، مرتبہ، قاضی جاوید، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۱۶ء
عظمیٰ فرمان فاروقی، ڈاکٹر، اردو ادب میں نسائی تنقید روایت مسائل و مباحث، سعید پبلی کیشنز کراچی، ۲۰۱۰
عقیلہ جاوید، ڈاکٹر، اردو ناول میں تانیثیت، شعبہ اردو بہاوالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۵ء
فاطمہ حسن، نسائی شعور ایک مابعد جدید رجحان (مضمون) مشمولہ، تانیثیت اور ادب، مرتبہ، انور پاشا عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، س۔ن
فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء
فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
فتح محمد ملک، تحسین و تردید (خالدہ حسین کا صوفیانہ انداز نظر)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء
کشور ناہید، عورت خواب اور خاک کے درمیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء
کشور ناہید، ادب اور نسائیت (مضمون) مشمولہ، تانیثیت اور ادب، مرتبہ انور پاشا، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی س۔ن
مرتضیٰ علی اطہر، فہمیدہ ریاض کی شاعری میں جدید عورت، کتابی دنیا دہلی، ۲۰۰۹ء
نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رفتہ و آیندہ (اردو ادب کا منظر نامہ)، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء
نگہت ریحانہ اختر، ڈاکٹر، اردو مختصر فنی و تکنیکی مطالعہ 1947، بک وائز میاں چیمبرز ٹمپل روڈ، لاہور، ۱۹۹۸ء
نورین رزاق، ڈاکٹر، پاکستانی خواتین افسانہ نگار (اردو افسانے کی روایت کے تناظر میں)، دستاویز مطبوعات، لاہور، س۔ن

رسائل و جرائد

آصف فرخی، دنیازاد، کتابی سلسلہ ۱۴۵اے بی پرنٹنگ سروسز، کراچی، ۲۰۱۷ء
ترنم ریاض،، نسائیت اور تانیثیت، (مضمون) رسالہ شمارہ 5، نسائیت اور نسائی ادب نمبر، ہم عصر شاعرات کے کلام میں تانیثی رویے، ۲۰۰۷ء
خالدہ حسین، انتخاب خواتین کا عالمی ادب (مضمون) ادبیات، جلد ۱۵، ۱۴، شمارہ ۶۰، ۵۹، ۲۰۰۲ء
فرزانہ کوکب، ڈاکٹر،، ملتان کے افسانوی ادب کی نمائندہ خواتین لکھاریوں کی تخلیقات میں تانیثی عناصر (مضمون) مشمولہ، دریافت، شمارہ، ۱۸، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

نازیہ یونس، ڈاکٹر، قتیل شفائی کی نظموں میں عورت کا المیہ، دریافت، شمارہ ۱۸، نیشنل یونی ورسٹی آف مارڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

مقالہ جات

صباحت مشتاق، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب کا تنوع، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی ذکریا یونی ورسٹی، ملتان ۲۰۰۶ء

عقیلہ جاوید، ڈاکٹر، اردو ناول میں تانیثیت، شعبہ اردو بہاو الدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۵ء

انٹرویو

بی بی امینہ سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد بتاریخ ۲ مارچ ۲۰۲۰ بوقت ۱۱ بجے دوپہر

بی بی امینہ، خالدہ حسین سے گفتگو (انٹرویو) مشمولہ، خالدہ حسین شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

نجیبہ عارف، ڈاکٹر، خالدہ حسین سے ایک یادگار انٹرویو، مشمولہ، دنیازاد، اے جی پرنٹنگ سروسز، کراچی ۲۰۱۷ء

لغات

ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، ڈاکٹر، کشاف تنقیدی اصطلات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۵ء

جمیل جالبی، قومی انگریزی لغت، مقدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۴ء

خواجہ عبد المجید، جامع اللغات ج، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء

سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء

نور الحسن نیر، نور اللغات ج، قومی کونسل برائے فروغ روڈ دہلی، ۱۹۹۸ء